تحفۂ گیلانی

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے تین نادرونایاب مضامین کا مجموعہ

فصل لربک وانحر

بقرعید۔یا۔عملی اسلام کا پہلا دن

شہادت حسنیٰ۔ماہ محرم کی تجلی ریزیاں

ترتیب:
محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری
جامعہ شیخ الہند، قاسم آباد، انجان شہید، اعظم گڈھ

تحفۂ گیلانی۔تین نادرونایاب مضامین کا مجموعہ

تفصیلات

نام کتاب :تحفۂ گیلانی (تین مضامین کا مجموعہ)

ترتیب :محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری

صفحات :٦٠

اشاعت :ذی الحجہ/۱۴۴۵ھ۔جون/۲۰۲۴

ناشر :حکیم الاسلام لائبریری، بیلی پار، گورکھ پور (یوپی)

2

دعائیہ کلمات

حضرت مولانا فرقان بدر قاسمی اعظمی

ناظم جامعہ شیخ الہند، انجان شہید، اعظم گڈھ

حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ، متنوع اوصاف وکمالات کی حامل شخصیت تھے، آپ کے قلم گہر بار سے نکلنے والے موتیوں نے، سیکڑوں رسائل ومجلّات کو نہ صرف زینت بخشی؛ بلکہ ان کی قبولیت میں موثر کردار ادا کیا، آپ کے قلم سیال سے نکلنے والے چند مضامین پر مشتمل یہ مختصر رسالہ، جامعہ شیخ الہند کے مؤقر استاد حضرت مولانا محمد فہیم صاحب قاسمی گورکھ پوری زید مجدہ کی حضرت گیلانی کی تحریروں سے عشق کا مظہر ہیں، مؤلف موصوف اس سے پہلے بھی مختلف رسائل ومجلّات میں گم، حضرت گیلانی کی کئی تحریروں کو منصۂ شہود پر لا چکے ہیں اور سیکڑوں صفحات پر مشتمل مقالات ومضامین منتظر اشاعت ہیں۔

اس طرح کے علمی مضامین کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کے لیے مؤلف موصوف ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔جزاہ اللہ عنی وعن جمیع المسلمین. بندہ عاجز اس رسالے کی اشاعت کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مزید علمی خدمات کی توفیق بخشے اور اس رسالے کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

حرفے چند

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی شخصیت، اہل علم کے یہاں محتاج تعارف نہیں، حضرت علامہؒ بلند پایہ مفسر، محدث، فقیہ، مؤرخ، متکلم، محقق، معلم اور بہترین خوش بیان خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ، ایک الگ اور خاص طرز انشاء کے مالک وموجد تھے، حضرت علامہؒ کے قلم اعجاز سے کئی شاہ کار کتابیں منظر عام پر آئیں اور مقبول عوام وخواص ہوئیں، ملک کے مشہور ومعروف رسائل ومجلّات میں، حضرت علامہؒ کے ہزاروں صفحات پر مشتمل، سینکڑوں مضامین ومقالات شائع ہوئے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے، آپ نے جس عنوان پر، جب بھی قلم اٹھایا اس پر عقلی اور نقلی دلائل کے انبار لگا کر، اپنے خاص انشاء پردازی سے اس کا لطف دوبالا کر دیا، وقت کے مشہور ادیب حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے مضمون ''محقق گیلانی''، میں لکھا ہے کہ:

''آپ ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں، خود اس کے موجد تھے''۔

آپ کے ابتدائی زمانہ میں جب سوانح ابو ذر غفاریؓ کی قسطیں، رسالہ ''القاسم''، میں شائع ہو رہی تھیں تو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک خط اس عنوان کے ساتھ ''خطاب من ہذا الحقیر الناظر فی کتاب السید مناظر'' حضرت علامہ کو ارسال فرمایا، جس میں لکھا کہ:

مولانا سید الکاتبین احسن اللہ مناظرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

احقر افقر نے شعبان ۱۳۳۶ھ کے رسالہ ''القاسم'' کے صفحات میں، آپ کا ایک بدیع مضمون بعنوان حضرت ابو ذر غفاریؓ پڑھا، میں اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ اگر مجھ کو رسالہ

''تکشف'' لکھنے کے زمانہ میں ملتا تو نہایت قدر وشکر گذاری کے ساتھ، کم از کم اس کے اقتباس کو، اس رسالہ کا جزو بناتا، اب بھی ہر ایسے شخص کو، جو ''تکشف'' کو مکرر چھپواوے اور اس کی نظر سے یہ سطریں گذریں ہوں، وصیت کرتا ہوں کہ میرے اس مضمون کو بعنوان ضمیمہ، رسالہ مذکورہ کے آخر میں ملحق کر دے، ان روایات کو جس مسئلہ کا ماخذ بنایا گیا ہے نہایت اہم مسئلہ ہے اور ماخذ بھی صریح وصحیح ماخذ ہے، مجھ کو جو کچھ اس سے مسرت ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا، کاتب سلمہ اگر محقق فن ہونے کے وصف سے متصف ہو چکے ہیں، تب تو یہ مضمون دلیل ہے ان کی محققیت متحققہ کی، ورنہ محققیت متوقعہ کی ضرور دلیل ہے''۔

اس رسالہ میں حضرت علامہؒ کے قلم اعجاز سے نکلے ہوئے دو ایسے مضامین شامل کئے گئے ہیں جو قربانی کی اہمیت وافادیت اور لطائف وحکم پر مشتمل ہیں، قربانی پر ہونے والے عقلی شکوک وشبہات کے جو جوابات اور لطیف نکتے بیان کئے گئے ہیں، ان تک حضرت علامہ کا ہی ذہن پہنچ سکتا تھا، ماہ محرم کے پیش نظر، حضرت حسینؓ کی شہادت کے اسرار ورموز پر روشنی ڈالی گئی ہے، پڑھنے والوں کے لئے اس مختصر رسالہ میں بہت کچھ ہے۔

پروف ریڈنگ میں حتی الامکان تصحیح کی کوشش کی گئی ہے، پھر بھی اگر کوئی غلطی رہ جاتی ہے تو بشری تقاضہ کے تحت درگزر فرمائیں اور مطلع فرمائیں تا کہ بعد میں اسے درست کیا جا سکے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی اس رسالہ کو افادہ عام کا ذریعہ بنائے۔ آمین

محمد فہیم قاسمی گورکھ پوری

جامعہ شیخ الہند انجان شہید اعظم گڈھ

۱۳/جون/۲۰۲۴

۶/ذی الحجہ/۱۴۴۵

بوقت: ۱۰:۳۰ شب/جمعرات

فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ

دوآبہ دجلہ وفرات قدیم کلدانی عدن:

انسان جن بھٹوں میں رہتا ہے، وہ بہت بلند ہورہے تھے؛ لیکن خود انسان پست ہورہا تھا، دوآبہ دجلہ وفرات کے ایک قدیم تاریخی شہر میں یہ حادثہ گزر رہا تھا، امریکہ اور یورپ والوں کی طرح ان کی عمارتیں اونچی ہو رہی تھیں، ایک منزل پر دوسری منزل کا اضافہ ہورہا تھا؛ لیکن انسانیت ایک زینہ سے لڑھک کر دوسرے زینہ پر اور دوسرے سے تیسرے زینہ پر گر رہی تھی، حتی کہ آج جس طرح عموماً اونچے ایوانوں میں صرف حیوان بسیرا لیتے ہیں، یعنی جو اپنی زندگی کا مقصد کھانے، پینے، مر جانے کے سوا اور کچھ نہیں رکھتے، اسی طرح کلدانیہ جو اس دوآبہ کا مرکزی شہر تھا، اس کے باشندے حیوان ہی نہیں؛ بلکہ حیوانوں کی بندگی اور غلامی کا طوق گلے میں ڈالے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔

اللہ اللہ مسجود ملائکہ گائے، بیل، بلی اور بندر کا ساجد بنا ہوا تھا اور حیوانات تو پھر بھی ذی شعور ہیں، ان کی پرستش تو انسانی پستی کا معتدل درجہ ہے، دردناک سماں اس وقت کا تھا ''زمین کا خلیفہ'' نفخت فیہ من روحی، کا پیکر لطیف، امانات الٰہیہ کا تنہا علمبردار، نباتات؛ بلکہ جمادات جیسی بے شعور ہستیوں کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا ہوا تھا، عناصر مادی، بے جان ستارے، بے حس آفتاب وماہتاب کے آگے ماتھا ٹیکے پڑا ہوا تھا، عذاب الٰہی کا یہ دہشت انگیز نظارہ تھا کہ یکا یک ان ہی میں سے ایک خوبصورت جوان نے نعرہ مارا:

انی وجھت وجھی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکین. میں نے اپنا رخ اس قوت کی طرف پھیر دیا، جس نے آسمانوں

اور زمین کو (نیستی سے) پھاڑ نکالا، میں اسی کی طرف جھکتا ہوں، میرے نزدیک اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

دعویٰ تھا اور کتنا بلند دعویٰ تھا، اس کے گھرانے کے لوگ مخلوق ہی کے نہیں؛ بلکہ مخلوق کی مخلوق اور انسانی مصنوعات کے گورکھ دھندوں میں الجھے ہوئے تھے، وہ فانی ہاتھوں کو نہیں؛ بلکہ فانی ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اپنے کو ربط دے رہے تھے؛ لیکن ان میں سے کیسا بلند ہمت نوجوان جو جمادات ونباتات کی دلچسپیوں سے علیحدہ ہوکر، آفتاب وسیارات کی قہر مانیوں یا مہربانیوں کو ٹھکرا کر، مادی کروں کو چیرتا ہوا، مخلوقات کے دائرے کو پھاڑتا ہوا، حتی کہ ملائکہ مقربین سے آنکھیں بچاتا ہوا، خدا جانے کس غیبی کشش کی بدولت یکا یک وہاں پہونچ گیا، جہاں غنا تھا، فقر کو راہ نہیں ملتی تھی، جہاں صرف رب رہتا ہے، مربوبات کی وہاں گنجائش نہیں، جو واقعی سب سے بڑا تھا، اس نے بھی پالیا کہ وہی سب سے بڑا ہے، اللہ اکبر جرأت اور کیسی جرأت۔

خلیلی امتحان:

دعوائے امتحان سے ثابت ہوتا ہے، علم عمل سے پختہ ہوتا ہے، امتحان لیا گیا، عمل کے لئے حکم ہوا، جنگلوں کے گپھوں میں نہیں، پہاڑ کے غاروں میں نہیں؛ بلکہ اسی سکھ اور دکھ کے آمیزہ میں، اسی حیرت کدہ دنیا میں حکم ہوا کہ سلطنت سے ٹکر کھاؤ، اس نے کھالی، حکم ہوا آگ میں پھاند جاؤ، پھاند گیا، گھر چھوڑ جاؤ، چھوڑ دیا، باپ سے قطع تعلق کرلو، اس نے کرلیا، قحط وگرانی کی مصیبت جھیلو، جھیل لی، دوسروں کے دروازوں پر جاؤ، روانہ ہوگیا، جو سب سے بڑی قوت سے وابستہ ہوگیا تھا، امتحان کے میدانوں میں اس سے یہ بھی کہا گیا، اپنی آبرو سے ہاتھ اٹھا، اسکی بیوی بھی چھین لی گئی، وہ دم بخود ہوکر راضی بہ رضا ہوگیا۔

یہ سب کچھ ہوا اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا، سورج اور چاند والے، گائے اور بیل والے، پھلتے تھے، پھولتے تھے اور اسکے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا تھا؛ لیکن مخلوق والا نہیں؛ بلکہ خالق والا بے پھل کے تھا، اس کے کوئی اولاد نہ تھی، امتحان اور کڑا امتحان، دس نہیں بیس نہیں، اکٹھے ۸۵/سال کا لمبا امتحان، سب کی آنکھوں کیلئے روشنی تھی؛ لیکن جس کا دل روشن تھا اس کی آنکھ اس سے محروم تھی؛ مگر بڑھاپے کے ان سخت دنوں میں جو ہم پر سخت ہیں؛ لیکن اس پر بہت آسان تھے، وہی جوانی کا نعرہ اسکی زبان پر جاری تھا، ہر راہ اور وادی میں وہ ان تمام باتوں کے بعد بھی یہی چلاتا پھرتا تھا:

’’**ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین**‘‘ میری پکار (میری پوجا) میری قربانیاں (اور نیتیں) بلکہ میری زندگی، میری موت (کسی مخلوق کیلئے نہیں بلکہ) اللہ کے لئے ہے، جو سارے جگت کا پالنہار ہے، اسکا کوئی ساجھی نہیں۔

مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں اپنا سب کچھ خدا کے سپرد کرتا ہوں اور اسکے آگے جھک جاتا ہوں۔

اس نے سب کچھ واپس کر دینے کا اعلان کیا تھا، تو لینے والے نے بھی اس سے جَو جَو کا حساب کر کے لیا، وہ قدرتی طور پر امین تھا، خیانت کی تاریکی اسکی روشن فطرت میں رہ نہیں سکتی تھی۔

جس وقت وہ آگ میں کودا تھا یہ سچ ہے کہ ’’**ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا**‘‘ (جسکی امانت ہو اس کو ادا کردو) کو پوری تعمیل کر چکا تھا؛ لیکن جتنا اپنے کو دینا آسان ہے، اپنی تمناؤں کا دینا اتنا آسان نہیں، خودکشی اتنی مشکل تو نہیں جتنا خودکشی کے اسباب و وجوہ کا برداشت کرنا، بال بچوں کی پرورش کیلئے سپاہی اپنی گردن کٹاتا ہے؛ لیکن بچوں کی گردنوں کا کٹوانا اس کے بس میں نہیں۔

ابراہیم (خلیل علیہ الصلوۃ والتسلیم) سے کچھ مانگا گیا، تو انہوں نے سب کچھ دے دیا، اپنے کو دیا، اپنے دھن اور وطن کو دیا، حتی کہ آخری شئ جس کیلئے جان و مال ہے، یعنی آبرو و ناموس، وہ بھی دے دی، اب ان کے پاس کیا تھا۔

ہاں ایک مطالبہ اور سخت مطالبہ، اس نے جگر دے دیا تھا؛ لیکن لخت جگر دینے کا موقع ان کو کہاں ملا، اپنی آنکھیں انہوں نے آگ میں جھونک دی تھیں؛ لیکن جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس سے وہ کب دست بردار ہوئے تھے، بابر تو خود تو مر سکتا ہے؛ لیکن ہمایوں کا گلا کس طرح گھونٹے، بالآخر وہ وقت بھی آگیا، ۸۵/سال کے بوڑھے کے گھر میں جو مصر کی شہزادی تھی، اس کے کان میں فرشتے نے آکر کہا:

’’تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی، اسکا نام اسماعیل رکھنا‘‘ (پیدائش باب ۱۶ادرس۱۰) اور انبیاء کی ولادت کی یونہی بشارت دی جاتی ہے، قرآن نے بھی ’’**وبشرناہ بغلام حلیم**‘‘ سے اس مژدہ کی تصدیق کی ہے، یہ تو صرف موجودہ مسلمانوں کی ذہنیت ہے کہ اپنے پیغمبر بلکہ دنیا کے پیغمبرؐ کی ولادت کے واقعات کو سن کر ’’مولود شہیدی کی روایت‘‘ کہہ کر، اپنے کو روشن خیالوں کی جماعت میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔

خیر یہ جملہ تو معترضہ تھا، مقصد یہ ہے کہ بچہ کی بشارت دی گئی اور اس زور شور کے ساتھ دی گئی کہ وہی فرشتہ مصر کی شہزادی سے پیامی بن کر بولا:

’’میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے‘‘۔

(توریت باب ۱۶ادرس۱۰)

الغرض بشارت ہوئی کہ لڑکی نہیں لڑکا ہوگا اور بڑی برکت والا ہوگا، دوسری جگہ اسی توریت میں اس برکت کی تفسیر ان لفظوں میں کی گئی ہے:

’’قومیں تجھ سے پیدا ہوں گی اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے‘‘۔

(پیدائش باب ۱۷،۱تا۸)

اور فقط یہی نہیں، بینا نگاہوں کو تو اسی بشارت کی روشنی میں یہ بھی نظر آ گیا، اسی بچہ سے وہ بھی ظاہر ہوگا، جس کے لیے ہستی ظاہر ہوئی ہے، آخر توریت میں اس بشارت کا جو یہ قطعہ ہے، اس کا کیا مطلب ہے ’’خداوند نے تیرا دکھ سن لیا، وہ عربی ہوگا اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف‘‘۔(پیدائش باب مذکور)‘‘

ریف میں کس کو دبایا جا رہا ہے، کردستان میں کس کے لیے فتنے بپا کئے جاتے ہیں، عرب میں تفرقہ اندازی کی گھنگور گھٹائیں کس کے لیے اٹھائی جاتی ہیں، اٹلی سے پیغام جنگ کس کو بھیجا جا رہا ہے، سنگٹھن کا نشانہ کون ہیں، شدھی کی دھمکی کس کو دی جاتی ہے، جانوروں کی گردنیں بچانے کے لیے انسانوں کی کس جماعت کی گردنیں کاٹی جاتی ہیں، ’’اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف‘‘ کا کتنا سچا اور کتنا دلچسپ تماشا ہے، تیرہ سو برس کے طویل عرصہ میں کیا اس تماشے کی کبھی تعطیل ہوئی ہے اور اس کو بھی جانے دو، ابراہیمؑ سے ابراہیمؑ کا مطالبہ نہیں تھا؛ بلکہ ان کی آرزو مانگی جاتی تھی اور کون نہیں جانتا تھا کہ ’’خندہ صبح تمنائے ابراہیم‘‘ کون تھا صلی اللہ علیہ وسلم، **ربنا وابعث فیھم رسولا منھم** یہ کس کی دعا ہے۔

بہر حال بچہ پیدا ہوا اور اپنے وجود میں اس وجود اقدس کو لے کر دنیا میں آیا، جس کے لیے ساری دنیا آئی اور جو ابراہیمؑ ہی کا نہیں؛ بلکہ سچ یہ ہے کہ ابراہیمؑ کے خدا کا بھی مقصد محبوب تھا۔

بزرگ اور بوڑھے خلیل کا دل مطمئن تھا کہ یہ نونہال پھلے گا، پھولے گا، بشارت مل چکی تھی، خدا کے وعدے پہ خلیل نہ جیتے تو کون جیتا؛ لیکن صرف انسانیت کی نہیں؛ بلکہ ایمان کی آزمائش کا بھی کتنا سخت وقت تھا کہ ننانوے سال جس کے آستانہ پر پڑے رہے، پوری صدی جس کا مالا جپتے رہے اور جس کے قدموں پر دھن من سب

کچھ لٹا چکے تھے، اسی کی طرف سے یکایک آواز آتی ہے۔

’’ابراہام! وہ بولا دیکھ میں حاضر ہوں، تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے (۱) بیٹے کو جسے تو پیار کرتا ہے، لے اور زمین مرو میں جا اور اسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے لئے چڑھا‘‘۔

پیدائش باب ۲۲/۲

برکت کا وعدہ اور سوختنی قربانی کا حکم دل ہی نہیں؛ بلکہ ایمان ہلانے والی بات ہے۔

و ظنوا ان قد کذبوا. انبیاء کبھی اس گمان میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہم جھٹلا دیے گئے۔

لیکن خدائے غیر مسؤول سے کون سوال کرے؟ احتجاج کر سکتے ہیں؛ لیکن **اواہ حلیم** ابراہیمؑ سے اس کی کیا توقع ہو سکتی تھی، حکومت کی راہ میں عائد سوال و جواب بھی ہو، لیکن عشق و محبت کی وادی میں تسلیم و رضا، خاموشی اور خوشی کے سوا کسی چیز کی گنجائش نہیں، اور واقعہ تو یہ ہے کہ ابراہیمؑ کو سوال کا حق بھی تو نہ تھا، جو اپنی زندگی، موت، بلکہ اپنی ہر چیز کو خدا کے سپرد کر دینے کا اعلان کر چکا تھا اور جو اپنے کو مسلم (سب کچھ سپرد کر دینے والا) کہتا تھا، اس کو دم مارنے کا کہاں موقع تھا، خلیل تو اپنا معاہدہ تو پورا کر، خدا اپنا وعدہ پورا کرے گا یا نہیں اس سے تجھ کو کیا بحث۔ آخر یہی ہوا بوڑھا باپ اٹھا اور اکلوتے بیٹے کے سامنے آیا، اس کے سامنے آیا جس کی پیشانی سے اس کی دعا چمک رہی تھی اور آخر بولا:

’’بیٹا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟‘‘

اکلوتے بیٹے نے جواب دیا:

(۱) توریت سے ثابت ہے کہ اسماعیلؑ بڑے بیٹے ہیں، پھر اکلوتے کے ساتھ یہودیوں کا اسحاقؑ کے لفظ کا الحاق کس قدر عجیب ہے۔

"ابا جان! جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے کر گزریئے، آپ مجھے ان شاء اللہ تھما ہوا پائیں گے"۔

۹۹ر سال کا پیر بزرگ ابا جان، شباب میں قدم رکھنے والے سیزدہ سالہ اکلوتے کو اپنے ساتھ لیتا ہے، اس کے ہاتھ میں چھری ہے، کہا جاتا ہے کہ خلیل نے آنکھوں پر پٹی باندھی لی تھی، ہائے! مگر دل پر کیا رکھا تھا، اس کو کون سمجھ سکتا ہے، پہاڑ کے دامن میں آئے۔

اسلام کا بنیادی پتھر:

اس کے بعد کیا ہوا، قرآن نے اعلان کیا کہ "**فلما اسلما**" جب دونوں مسلمان ہو گئے، مسلمان کیا ہوئے، انسانیت کے افق سے "اسلام" "تفویض کلی" "ردامانت" کی ایک تابناک بجلی عالم کون میں کوند گئی، بوڑھے باپ نے اکلوتے کو پیشانی کے بل پٹک دیا اور اس کی گردن پر چھری چلا دی، جس کے ذبح ہو جانے سے کائنات ذبح ہو جاتی، پھر جیسا کہ ابراہیمؑ کے ساتھ پرانا دستور تھا کہ ابراہیم امانت سمجھ کر واپس کرتے تھے اور دینے والا انعام وجزا کہہ کر اس سے کہیں زیادہ کر کے پھر ابراہیمؑ ہی کی طرف پلٹا دیتا تھا، آگ گلزار بنائی گئی، عراق چھوڑا تو شام کی زمین ملی، بت تراشوں کے گھرانے کی بوڑھی بیوی کے ساتھ مصر کی جوان شہزادی عطا ہوئی، آج بھی وہی ہوا کہ آواز آئی:

ونادیناہ ان یا ابرھیم قد صدقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین. ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو پورا کر دیا میں احسان واخلاص والوں کو یوں ہی بدلہ دیا کرتا ہوں۔

وہ بدلہ کیا تھا؟ **انی جاعلک للناس اماما** (تمہیں ابراہیمؑ! بنی آدم کی امامت دی گئی) اسی کی پشت سے، ہاں اسی بچے کے مطلع سے دنیا کا سب سے بڑا

تحفۂ گیلانی۔ تین نادرونایاب مضامین کا مجموعہ

سردار، قوموں کا امام، ممکنات کا مرکز قیام، **وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا** کا پروانہ لے کر اسی پہاڑ کے دامن سے جہاں ابراہیمؑ نے اپنا آخری امتحان پورا کیا تھا، طلوع ہوا، بڑھا چڑھا اور ساری دنیا پر اس کی روشنی پھیل گئی، پھیل رہی ہے اور پھیل جائے گی، خدا کا وعدہ پورا ہوگا۔ ابراہیمؑ کے اس امتحان نے امامت کبریٰ کو پیدا کیا، امامت نے اس کو پیدا کیا جو "سود وزیاں" کے مرکب کو قلیل کر کے صرف سود مند عناصر کی نہر جاری کرتا ہے، یہ نہر اس کو دی گئی۔

لفظ کوثر کی تشریح: یہ امامت کبریٰ کیا ہے، لوگ کوثر (سب سے زیادہ بھلائی) کی تفسیر میں یوں کہتے ہیں کہ اس سے مراد فقط نہر یا نبوت کبریٰ یا قرآن یا علم و حکمت یا اولاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا امت محمدیہ یا علمائے امت یا اسلام ہے، یہ کیسا اختلاف ہے؟ کیا یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں نہیں؟ کیوں نہیں کہا جاتا؟ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **انا اعطینک الکوثر** میں کوثر سے مراد وہ ساری بھلائیاں ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئیں، بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد سعید بن جبیرؒ نے جب یہ تفسیر بیان کی تو کسی نے پوچھا کہ عام لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ "کوثر سے مراد ایک نہر ہے۔ سعید نے جواب میں کہا:

ان النھر فی الجنۃ من الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ. جنت کی نہر بھی تو اسی خیر کا ایک جز ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔

ابراہیم خلیل اللہ نے سب کچھ واپس کر دیا تھا، اس لئے اس کو اس کے نور نظر کو سب کچھ دے دیا گیا، ساری کائنات انسان کے لیے اور سارے انسان ابراہیمی ملت کے قدموں کے نیچے ڈال دیئے گئے، تو کیا ساری کائنات ان کو نہیں دی گئی، اس خیر و شر کے مرکب سے صرف "عناصر خیریہ" کو تحلیل کر کے ابراہیمؑ اور اس کی "پیاری دعا" کے حوالے کی گئی، جو کچھ بیٹے کو ملا وہ باپ ہی کو ملا، پس یہ کس قدر صحیح ہے کہ اے نبی!

اے ابراہیمؑ کے فرزند سعید! میں نے تو تجھے کوثر عطا کر دی، یہی وہ راز ہے کہ جب دعائے خلیل فاران کی چوٹیوں سے چہرہ پرداز ہوئی، تو اس کی آواز، مقدس آواز یہی تھی، ''**اتبع ملة ابراهيم حنيفا'' ملة ابيكم ابراهيم**'' لوگ اس پر کیوں متحیر ہیں کہ خیر صفاتی اور نہر جسمانی میں کیا وحدت ہے؟ لیکن غور نہیں کرتے کہ جسمانی دودھ کی تعبیر علم سے جب کی گئی تو اس میں کیا وحدت تھی؟ مٹی کو گیہوں سے، گیہوں کو گوشت سے، آنکھ سے، بھیجے سے، حتیٰ کہ قوت بینائی سے شنوائی سے کیا نسبت ہے؟ وجود کے ان مختلف مراتب میں کیا وحدت ہے؟ فرق مراتب وجود سے آنکھیں کیوں بند کی جاتی ہیں؟ اگر موت مینڈھے کی شکل میں ذبح ہوسکتی ہے؛ اگر قرآن کی سورتیں بادلوں اور پرندوں کے پرے کی شکل میں نمایاں ہوسکتی ہیں؛ اگر اعمال و افعال سانپ، بچھو، ڈھال وسپر کے قالب میں ظاہر ہوسکتے ہیں، تو امامت کبریٰ یا اسلام؛ اگر ایسی نہر کی شکل میں ظاہر ہو، جس کے کنارے پر موتی کے قبے ہوں، تو اس میں جھنجھلانے کی کیا بات ہے۔ تم تو بن دیکھے جھٹلاتے ہو؛ لیکن دیکھ کر ہماری روح کے دکھانے والے نے کہا: جب مجھے آسمانوں پر چڑھایا گیا تو میں ایک نہر پر پہنچا جس کے کناروں پر موتی کے قبے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ کوثر ہے۔ (بخاری شریف)

اسماعیلؑ، ہاجرہ مصر کی شہزادی کے دکھ کی دعا کے جواب تھے، دکھ کی دعا کا جواب سکھ ہی ہوسکتا ہے، پس یہی تو ہاجرہ سے کہا گیا کہ خداوند نے تیرے دکھ کو سن لیا اور اس کو وہ بیٹا دیا گیا جس کی پشت سے خم خانہ کوثر کا پیمانہ بردار (صلی اللہ علیہ وسلم) اٹھا اور اس نے انسانی روح کی تشنگی کو بجھانے کے لئے حوض کوثر کا افتتاح کیا، جس کے کنارے بقول حضرت عائشہؓ آسمانی تاروں کے برابر گلاس اور پیمانے چنے ہوئے ہیں۔ (بخاری شریف)

قربانی سے اسلام کا تعلق:۔

پیئے جاؤ، پلاتے جاؤ، ساقی کوثر کے فدائیو! دنیا کے آخری کناروں تک، نسل آدم کے ہر فرد کو، یہاں بھی وہاں بھی دکھ کو نکالو، سکھ کی نسیم پرورانسانی بستیوں تک، ہندو چین میں، امریکہ اور یورپ میں، جزائر اور کوہستانوں میں، دنیا پیاسی ہے، پھر لوگ اس حوض کا پانی لے کر کیوں نہیں دوڑتے جس کے متعلق بخاری اور مسلم میں ہے ''جس نے اسے پی لیا وہ پھر پیاسا نہ ہوگا'' یہ کوثر اسی سپردگی، اسلام، اسی ''**فلما اسلما و تله للجبين**'' کے صلہ میں ملا، جو ۱۰/ذی الحجہ ۹۹ ابراہیمی میں مروہ کے دامن میں منٰی کے میدانوں میں صدق واخلاص کے سرچشمہ سے ابل کر، عملی شکل میں متشکل ہوا۔ باپ نے بیٹے کی قربانی کی تھی اور قربانی ہو بھی گئی؛ اگرچہ نہیں ہوئی۔ زید بن ارقمؓ صحابی فرماتے ہیں کہ چند صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ قربانیاں کیا ہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ صحابہ نے پوچھا تو ہمارا اس میں کیا حصہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر روئیں کے بدلے ایک نیکی۔ (رواہ احمد فی مسندہ)

ترمذی کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربانی سے زیادہ پسندیدہ عمل ۱۰/ذی الحجہ کو اور کوئی نہیں ہے، قیامت کے دن قربانی شدہ جانور لایا جائے گا، اپنے کھروں، بالوں، سینگوں، کے ساتھ لایا جائے گا۔ فردوس دیلمی کی کتاب اگرچہ حدیث کی مستند کتابوں میں نہیں ہے تاہم اس کی روایت ہے واللہ اعلم بحقیقۃ الحال کہ قربانی کے جانور پل صراط کی سواری ہوں گے، کس طرح ہوں گے، یا کیا ہوں گے، اس کو اس وقت کون جان سکتا ہے؟ لیکن قرآن میں ہے ''خداوند تعالیٰ قربانی کے گوشت اور خون کو نہیں لیتا ہے؛ بلکہ وہ تو تم سے صرف تقویٰ لیتا ہے، **لن ينال الله لحومها ولا دمائها ولكن يناله التقوى منكم.**

قربانی سے تقویٰ مقصود ہے:

ابراہیمؑ کی قربانی سے بھی اسمٰعیلؑ نہیں لئے گئے؛ بلکہ دونوں باپ بیٹے سے وہ دولت لی گئی، جس کی بدولت ابراہیمؑ کہتے پھرتے تھے کہ '' **ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین** '' دل پر غیر کی کتنی حکومت ہے، روح میں دوسرے کے فعل کی، دوسرے کی صفت کی، دوسرے کی قوت کی، دوسرے کے وجود کی کتنی اہمیت ہے؟ تم غیروں سے کتنے بچے ہوئے کتنے متقی ہو؟ جب انسانیت نکھر کر بالکل خالص ہو جاتی ہے، تو پھر اس کو کون روک سکتا ہے، وہ کھنچتا ہے، رب قدوس کی طرف، وجود محض کی طرف، خیر مطلق کی طرف، تجلی گاہ ربانی کی طرف، جنت کی طرف، کھنچتا ہے کھنچ جاتا ہے جو خیر ہو گیا وہ طبعی طور پر سرچشمہ خیر سے جا ملتا ہے۔ پل صراط کے متعلق تو یہی آیا ہے کہ کوئی تارنگاہ کی طرح، کوئی برق اور بجلی کی طرح، کوئی تیز آندھی کی طرح، کوئی سناٹے بھرنے والے پرندے کی طرح اور آخر میں یہ کہ کوئی گھوڑے کی چال سے، کوئی اونٹ کی چال سے، جنت کی طرف کھنچے گا، (ماخوذ از بخاری و مسلم) جو جتنا خالص تھا، جو جس قدر متقی تھا، اسی حساب سے اس کی کشش بھی ہے، لوہے کا جتنا جز کسی شئے میں ہوگا اسی حساب سے وہ مقناطیس کی طرف کھنچے گا، لیکن کیوں کھنچا؟

تقوی کی شدت وضعف کے یہ آثار ہیں، تقوی کا اکتساب علم سے کیا جاتا ہے، علم کی جانچ عمل سے ہوتی ہے، ابراہیم خلیلؑ نے جان و مال، آبرو، عزت، حتی کہ جس کے لئے سب کچھ ہوتا ہے یعنی لخت جگر، نور نظر کی قربانی کر کے ''اپنے تقویٰ'' کو پیش کیا اور صرف اسمٰعیلؑ ہی کا معاملہ ہوتا تو غنیمت تھا، سچ تو یہ ہے کہ ابراہیمؑ کی قربانی بڑی قربانی تھی، اس نے خدا کی قربان گاہ پر اس کو لا کر بھینٹ چڑھا دیا، جس پر ساری دنیا قربان ہے، صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ ابراہیمؑ ہی کا کلیجہ تھا، ابراہیمؑ ہی کا تقویٰ، اسی کا

تحمل تھا۔

بہر حال یہ وہ تقوی تھا، جس کو خدا نے ابراہیمؑ سے لیا یہ اس کی رحمت ہے اور ہمارا ضعف ہے کہ صرف چند سکوں کی قربانی سے جن سے قربانی کے جانور خریدے جاتے ہیں فقط اسی تقویٰ کو ہم سے قبول کر لیتا ہے، پھر قربانی کا حاصل شدہ تقویٰ اگر پل صراط پر ہماری رفتار، ہماری کشش کو تیز کر دے اور ہم ان ہی قربانیوں کے بل بوتے پر خدا کے فضل کی طرف کھنچ جائیں تو لوگ اس پر استہزاء کیوں کرتے ہیں، ہاں! جس نے خراب وخستہ، بڈھی، مریل قربانی کے ذریعہ سے اپنا تقوی پیش کیا، کیا وہ خود نہیں دیکھتا کہ اس کے تقوی میں ضعف ہے اور اگر ضعف کی بدولت وہ بجائے سرچشمہ خیر کے لڑکھڑا کر شر کے اندھے کنویں میں گر گیا تو کیا قدرت کا یہی اٹل قانون بھی نہیں ہے۔

حصول تقویٰ کا ذریعہ قربانی کیوں ہے؟:

جن احساسات کو ہمارے اندر قوت سامعہ پیدا کرتی ہے کیا قوت شامہ سے ہم ان کو حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ خوشبوں سے بھی مقصود دلی راحت، انشراح و انبساط کا اکتساب ہے اور جو سریلی آوازوں کی طرف کان لگاتا ہے وہ بھی اپنے دل کو خوش ہی کرنا چاہتا ہے، مقصود دونوں کا ایک ہی ہے، لیکن وہ احمق ہے، جو مسرت کی ان دونوں کیفیتوں میں فرق نہیں کرتا، نغمہ اور خوشبوں کی خصوصی تاثیرات سے قطع نظر کرنے والا کائنات کی گوناگونیوں اور بوقلمونیوں کے اسرار و اغراض کو جھٹلاتا ہے، تمہارے باغ میں اگر انگور ہیں اور ان سے تمہارا ذائقہ لذت اندوز ہو سکتا ہے، تو سب کے درختوں کو کیوں کاٹتے ہو، انگور میں جو کچھ ہے اسے چوسو اور سیب جو کچھ دیتا ہے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرو، مجھ سے میرے دوست یہ کیوں کہتے ہیں کہ کیا قربانی کی جگہ صرف دام کا خیرات کر دینا مفید نہ ہوگا، خیرات سے بھی تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور قربانی سے بھی ''تقویٰ'' کا لینا خدا کا مقصود ہے؛ لیکن دونوں کو ایک کیوں کرتے ہو،

گلاب سے بھی آنکھیں سیراب ہوتی ہیں؛ لیکن اس کی باصرہ نوازی وہی ہے جونسرین ونسترن، سیوتی اور یاسمن کے سادہ رخساروں سے دلوں کو ملتی ہے، چمن میں وہ بھی ہے اور یہ بھی، اس کی غرض اور ہے اس کی غرض اور، اس بنگلہ کے مالک کو میں نہایت حیرت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا جو اپنے پائیں باغ سے گلاب کے سوا اور پھولوں کے گملوں کو نکال نکال کر پھوڑ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ میری آنکھوں کی سیر کرنے کے لئے کیا گلاب کی پنکھڑیاں کافی نہیں ہیں؟

کیا قربانی کرنے میں جیو ہتیا ہے:

لیبر لینڈ (مزدورستان یا کلی کھیڑا) کے باشندے کہتے ہیں اور صرف وہی کہتے ہیں، ان کی ایک محدود جماعت کہتی ہے، محدود جماعت کے چند طبقات کہتے ہیں اور ان طبقات میں سے بھی اکثر کرتے تو وہی ہیں جو اپنے ۳۲ دانتوں میں کچلی رکھنے والے انسان کرتے ہیں؛ لیکن کہتے ہیں، خدا جانے کن مصلحتوں کی بنا پر کہتے ہیں کہ جانور کو کیوں ذبح کرتے ہو، جاندار ہستیوں کو کیوں مارتے ہو، کتنی اچھی بات کہتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ رحم جس کا تخم تمام عالم کی انسانی فطرت کی گہرائیوں میں بویا گیا تھا اور بجز اس مسئلہ کے ہر موقع پر ہر جگہ اس کی نمائش بھی ہوتی رہتی ہے، اس کے آثار ہویدا ہوتے ہیں یکایک ساری دنیا سے سمٹ کر صرف ان ہی سینوں میں اتر آیا ہے، اسی ملک کے باشندوں میں اس کا مواد جمع ہو گیا ہے، جس کی قسمت میں محکومیت کے سوا تاریخ والو کے نزدیک اور کچھ لکھا ہوا نہیں ہے، مبارک ہے وہ ملک جو جانوروں پر رحم کھاتا ہے اور کسی کو اپنے ملک میں آنے سے نہیں روکتا، یا جذبہ رحم کی مغلوبیت سے نہیں روک سکتا، وہ دوسروں کو مار نہیں سکتا کہ وہ جاندار ہیں، حتی کہ خود بھی نہیں مرسکتا کہ اس کے پاس بھی جان ہے۔

موت کا علاج: موت! کتنا بھیانک لفظ موت! ہمارے ملک میں،

ہمارے مزدور ملک نے اس کا تو احساس کیا اور سبھوں نے کیا، بڑی مشکل شئی، نہایت دشوار حقیقت؛ لیکن جس طرح اس کی دقتوں کو انہوں نے محسوس کیا تھا، کوشش کرتے کہ اس مشکل کے حل کی کیا راہ ہے؟ مارتا بھی اٹھ جاتا ہے، اور مارا جاتا بھی اٹھا دیا جاتا ہے؛ لیکن مرنے کو کون ٹالے، ہاں! اس نے ٹالا جس نے اس کی تلخی میں مادر وطن کے نام کو شریک کر لیا، واٹر لو کے میدان میں، اے تلخ و تیز موت تو ''مدر لینڈ'' کے منتر سے کتنی آسان ہو گئی، پورٹ ارتھر میں تیرا جام کتنا خوش گوار تھا، جب ''حب وطن'' کے چھینٹے تجھ میں شریک کر دیئے گئے، ''تم وطن کے لئے ہو'' ایک آواز موت کی تلخی کو دھو دیتی ہے، ''تم قوم کے لئے ہو'' کتنا پیارا نغمہ جس نے ہمیشہ موت کی سختی کو نرم کر دیا؛ لیکن اسی کے ساتھ ایک اور آواز دی جاتی ہے ''تم اس کے لئے ہو جس کے لئے سب کچھ ہے'' تو بتاؤ کہ روح کی بیتابی کا کیا حال ہو، جانوں کے اضطراب کی کیا کیفیت ہو؟ لوگ شاعری سمجھیں گے؛ لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ بدر کے میدان میں اور حنین کی وادی میں، قادسیہ اور یرموک کی گھاٹیوں میں اس نداء نے موت کو جتنا شیریں جتنا لذیذ کر دیا تھا کبھی نہیں کیا، انا للہ و انا الیہ راجعون. موت کیا تھی، ان میدانوں میں کیا تھی؟ ایک کھیل تھی، ایک تماشا تھا، جس کا سب کچھ ہے اور جسکی طرف سب جا رہے ہیں، اسی کیلئے اسی کی طرف جانے کے لئے، موت کے موٹر کی تلاش کس بے تابی کے ساتھ کی جاتی ہے!

ہتیا کا حکم اسلام میں:

''جیو ہتیا'' نہیں کرنا چاہتے، جانوں کو ایذا نہیں پہنچانا چاہتے، اسلام کا بھی یہی حکم ہے، بلا وجہ کسی جاندار کے ستانے کو کون جائز رکھ سکتا ہے، جانوروں کو بلا وجہ مارنے والے خاتم النبیین ﷺ کی زبان پر ملعون کئے گئے ہیں، ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر لعنت کی ہے، جو کسی جاندار چیز کے

ساتھ چاند ماری کھیلے‘‘ اور فقط اس طرح جیو ہتیا کرنے والے ہی ملعون نہیں ہیں؛ بلکہ دنیا کے آخری اور سب سے بڑے پیغمبرﷺ کی زبان مبارک پر وہ بھی ملعون کیا گیا ہے جو کسی جاندار کو یوں ہی دکھ پہنچائے، صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرتﷺ ایک گدھے کے پاس سے گذرے آپ نے دیکھا کہ اس کے چہرہ کو داغا گیا ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ’’خدا کی اس پر لعنت ہے جس نے اس کو داغا‘‘۔

مسلم ہی میں ہے کہ آپ نے عموماً جانوروں کو ان کے منہ اور چہرہ پر مارنے کی ممانعت فرمادی ہے اور صرف مارنے پیٹنے پر کیا موقوف ہے، جانوروں کو کھانے پینے کی تکلیف پہنچانا اسلام میں بہت بڑا گناہ ہے، اسی طرح ان کو آرام پہنچانا بہت بڑا ثواب ہے، معراج کی حدیث میں ہے کس نے نہیں پڑھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عورت کو جہنم میں عذاب بھگتے دیکھا، اس نے ایک بلی پال رکھی تھی، جس کو نہ چھوڑتی تھی کہ خود چل پھر کر کچھ کھائے اور نہ خود کھلاتی تھی، اسی طرح آپ نے فرمایا کہ ایک شخص جنت میں فقط اس لئے گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو اپنے موزہ سے پانی نکال کر پلایا، یہ دونوں روایتیں بخاری میں ہیں، صرف ان ہی دو روایتوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جانداروں کو دکھ اور سکھ پہنچانے میں اسلام کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔

بلاشبہ مرنے میں بھی اذیت ہوتی ہے، خود مرے یا دوسرا مارے، نزع روح کی تکلیف دونوں میں مشترک ہے، پھر کون ہے کہ ’’موت‘‘ آہ! کہ ’’تلخ موت‘‘ کے پنجہ کو جاندار ہستیوں کے حلق سے ہٹالے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ’’مارنا‘‘ چھوڑ دو، لیکن کیا ممکن ہے؟ پانی کے ہر قطرہ میں ہزاروں کیڑے رہتے ہیں، ان کا مارنا کس طرح بند ہو؟ سانپ، بچھو، کھٹمل، جوں، کے مارنے کو کون روک سکتا ہے؟ تالابوں سے، باولیوں سے پانی نکالا جاتا ہے، تالاب کا

پانی خشک ہوجاتا ہے اور انسان ہزاروں جانوروں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگین کرتا ہے، کھیتوں کے سوراخ میں خدا جانے کتنے کیڑے، مکوڑے رہتے ہیں، ان کی گردن الگ ماری جاتی ہے، اور آہ! اگر اس امر کو چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اناج کے بغیر پھر انسان کا گلا گھٹتا ہے، آخر وہ بھی تو جاندار ہے، اس کو بھی جانے دو، جگدیش چندر بوس کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ درختوں کو بھی کاٹنے سے تکلیف ہوتی ہے اور اس مسئلہ کو یورپ اور امریکہ کی تجربہ گاہوں میں انہوں نے سائنس کے غیر مشکوک آلات سے مشاہدہ بھی کرادیا اور الغرض ’’مارنے‘‘ کے روکنے پر ہم قادر بھی ہوجائیں تو مرنے کو کون روک سکتا ہے، موت کی تکلیف تو پھر بھی باقی رہ جاتی ہے، کسی نے نہیں کوئی نہیں، ان میں سے ایک بھی نہیں، جس نے اس مسئلہ کو سوچا، اس عقدہ کو سلجھایا۔

ذبح میں تسمیہ کی شرط:۔

عالم کے اس ’’کرب‘‘ کو بھی جس نے سنا، روحوں کی اس چیخ کی طرف جس نے توجہ کی، وہ بھی وہی تھا، جس نے عالم کی دوسری مشکلات کو آسان کیا، ارے ’’حب وطن‘‘ کے منتر سے موت کی کلفت لذت بن جاتی ہے، قوم کے نام سے جب ’’مرگ کا پیالہ‘‘ امرت بن جاتا ہے، تو پھر دنیا کو یہ پیغام کیوں نہیں سنایا گیا کہ وطن اور قوم جس کے لئے ہے، آسمان وزمین جس کے لئے ہے، ذرہ سے لے کر آفتاب تک جس کے لئے ہے اس ’’مقدس نام‘‘ سے اس مشکل کو حل اور ہلاہل کو ساغرمل بنایا جاسکتا ہے، اور یہی وہ راز ہے کہ اسلام نے اعلان کیا کہ کوئی چیز نہ ماری جائے، نہ کسی جانور کو ذبح کیا جائے، جب تک کہ اس پر اس ’’مقدس اور بڑے نام‘‘ کا ذکر نہ کرلیا جائے، قرآن نے اس حکم کی تشہیر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کنجشک یا اس سے بڑے جاندار کو مارے گا تو خدا کے یہاں جواب دہ ہوگا، جب تک اس کا ’’حق‘‘ نہ ادا کردے، صحابہ نے پوچھا کہ اس کا کیا حق ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا کا نام لے کر ذبح کرنا'' جیو ہتیا کے وبال سے بچنے کی یہی راہ ہے، عرب کا گھوڑا اپنے آقا کو پہچانتا ہے، ہندوستان کا ہاتھی اپنے مالک کو جانتا ہے، یورپ کا کتا اپنے میڈم سے محبت کرتا ہے؛ اگر یہ سچ ہے اور قطعاً سچ ہے تو پھر میرے اس بیان کی کیوں تکذیب کی جاتی ہے کہ دنیا کے جاندار اپنے جان آفریں کو پہچانتے ہیں، تم پر اپنے آقا کے لئے، اپنے وطن کے لئے، اپنی قوم کے لئے مرنا آسان ہے، ان پر اپنے خدا کے لئے اپنے پالنے والے کے لئے جس طرف ہر چیز پلٹ کر جانے والی ہے، اس کے لئے جو ساری موجودات کا سرچشمہ ہے، سب سے بڑا ہے، اسکے لئے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کا کلمہ جانفزا سن لینے کے بعد مرنا آسان ہو جاتا ہے۔

پس جو پانی کے کیڑوں کو بغیر بسم اللہ کے پیتا ہے، جو کسی جانور کو بغیر بسم اللہ کے مارتا یا ذبح کرتا ہے اور جو کسی درخت کو اللہ کا نام لئے بغیر کاٹتا ہے بلاشبہ وہ ''جیو ہتیا'' کا مرتکب ہے، پر جس نے جانوروں کی ''تلخ موت'' کو ''موت شیریں'' سے بدل دیا وہ ان کا دشمن نہیں؛ بلکہ محسن ہے، کیوں کہ وہ اگر ذبح نہ ہوتے تو کبھی نہ کبھی خود مرتے اور موت کی ساری اذیتوں کے ساتھ مرتے کتنا مبارک ہے وہ انسان جس نے جاندار ہستیوں کو ایک بڑی مصیبت سے نجات بخشی۔

حنانہ کا ستون خدا ہی کو نہیں خدا کے رسول کو بھی پہچانتا ہے، اشجار و احجار صرف خدا ہی کے حکم کو نہیں جانتے؛ بلکہ اس کے پیغمبر پر سلام بھیجتے ہیں، اس کی رسالت کی شہادت دیتے ہیں، کیا وہی اونٹ جو آنحضرت ﷺ کے قدموں پر سر ڈال کر روتا اور بلبلاتا تھا اور اپنے مالک کی شکایت کرتا تھا کہ وہ مجھ سے کام زیادہ لیتا ہے؛ لیکن کھلاتا کم ہے، کیا یہ عقل کی بات ہے کہ وہ حضور کو تو پہچانتا تھا؛ لیکن حضور ﷺ جس ذات اعلیٰ کے رسول اور عبد تھے اس کی کوئی معرفت اپنے پاس نہیں رکھتا تھا اور یہی وہ

راز ہے کہ ''صحیح ذبح'' ایسا ذبح جس کے متعلق آخرت میں پرسش نہ ہوگی اور جسکو کھایا جا سکتا ہے، اس کے متعلق تسمیہ کی شرط لگا دی گئی؛ بلکہ ہر فعل کی ابتدا میں بھی اس شرط کو عام کر دیا، تا کہ اس نام سے جہاں اور برکات حاصل ہوتے ہیں وہاں ایک نفع یہ بھی ہے کہ اگر کسی فعل یا عمل میں دانستہ یا نادانستہ کسی جاندار سے دامن الجھ جائے تو اس کی پاداش سے انسان بچ جائے، جین مت کے متقشف رات کو نہیں کھاتے، منہ پر ڈھانٹے باندھتے ہیں کہ کہیں غذا یا سانس کی راہ سے کوئی کیڑا منہ میں نہ چلا جائے، لیکن جس نے ''بسم اللہ'' کہہ کر ''میدان عمل'' میں قدم رکھا ہے یا جو بسم اللہ کہہ کر کھاتا ہے وہ ان تمام قیود سے آزاد ہے اور ان سے زیادہ بہتر طریقہ سے حیوانات کی موت اور اذیت کے مسئلہ کو اس نے آسان کر دیا، علی الخصوص قربانی کے موقع پر جو جاندار اللہ کے نام سے اپنی مشکل کو حل کرتا ہے اس کی بلند قسمت کے کیا کہنے، جس جگہ پر اسمعیلؑ کو ہونا چاہئے اللہ اللہ آج اس مقام پر خدا کی رحمت کا تو اندازہ کرو کہ ایک جانور ہے۔

انسانی خوراک بن جانے کے بعد حیوان ایک درجہ بلند ہو جاتا ہے: مٹی گھاس میں جا کر گھاس بن جاتی ہے، گھاس بکری میں پہنچ کر بکری بن جاتی ہے، پھر کیا یہ کہنا غلط ہے کہ بکری انسان میں جا کر انسان ہو جاتی ہے، انسان جب ترقی کرتا ہے تو دنیا کی زندگی سے آگے بڑھ کر بہشت کی زندگی حاصل کرتا ہے، اسی طرح اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ جانور ذبح ہونے کے بعد انسان کی غذاء بن کر جنت میں پہنچ جاتا ہے، تو لوگ اس پر ہنستے کیوں ہیں؟ ہر ماتحت کے لئے اس کا بالائی درجہ جنت نہیں تو اور کیا ہے۔ لوگوں نے تعمیر کا نام تخریب رکھا ہے؛ لیکن نام سے حقیقت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

مسئلہ گاؤ: خالق سے چھوٹ کر جو لوگ مخلوقات کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سب جانوروں پر نہیں؛ بلکہ ہمیں صرف ان حیوانوں کے متعلق اعتراض

ہے جو ہمارے ''معبود'' ہیں، اگر چہ تناسخ ماننے والوں کے منہ سے یہ بات کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی، حیوانی جیون میں جو''پاپی'' عذاب بھگت رہا ہو کیسی عجیب بات ہے کہ وہی پاپی ''معبود'' بھی ہو جاتا ہے؛ لیکن خیر اس سے ہمیں کیا، ہم تو صرف اتنا پوچھتے ہیں کہ جب آپ کا مسلک ہی مخلوق پرستی ہے، تو پھر آج آپ کسی ایک یا دو جانور کو پوجتے ہیں اس لئے ہم اسے چھوڑ دیں، لیکن کل آپ کے معبود میں کسی اور کا اضافہ ہو گیا اور ہوتا ہی رہتا ہے، تو پھر ہم کہاں تک صبر کر سکتے ہیں، جو کسی جانور کو پوجتے ہیں کیا ان کے لئے مشکل ہے کہ آج وہ مثلا لنگور یا گائے کو پوجتے ہیں کل وہ مرغی اور بکری کو بھی پوج ڈالیں، پرسوں گیہوں اور چاول کے آگے بھی ماتھا ٹیکنے لگیں، آخر اس حماقت کا ساتھ انسان کب تک دے سکتا ہے۔

ایک جدید احتجاج کا اندیشہ:۔سنا ہے کہ مخلوق پرستوں کی کوئی جماعت ہے، جو انسانوں کے عضو مخصوص (لنگ اور بھگ) کو پوجتی ہے، اور اس کا ارادہ ہے کہ ختنہ کرانے والی قوموں سے جنگ کرے کہ کیوں اس کے معبود کی گردن کاٹتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ گائے کو تو معدودے چند لوگ قربانی میں دیتے ہیں؛ لیکن اس غریب دیوتا کی گردن تو ہر ایک مارتا ہے اگر یہ مسئلہ چھیڑا تو پھر ختنوں کی خیر نظر نہیں آتی۔

غلامستان میں ایک نرا نزاعی مسئلہ قربانی کا ہو گیا ہے، میں اسکے سمجھنے سے بالکل عاری ہوں کہ ہندو مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ قربانی ترک کر دو، گائے کو ذبح نہ کرو، سنا ہے کہ اسکے جواب میں مسلمان کہتے ہیں کہ تم سود چھوڑ دو، یہ عجیب مطالبہ ہے، نہ سائل کا پتہ ہے، نہ مجیب کا، ایسی دو قومیں جو محکوم ہیں جن کا اتفاقی امام یا امیر نہیں، کیا ایسے منتشر شیرازہ میں کسی سوال کا پیش کرنا اور اس کے عملی جواب کی کوئی امید ہو سکتی ہے۔کلی کا کلی سے مطالبہ ہے، افراد سب آزاد ہیں، اور آخر ان کو کون پابند بنا سکتا ہے۔

بنارس کے ایک پنڈت جی کہتے ہیں کہ مسلمان ہمارے دشمن ہیں کہ وہ ''گئو ہتیا'' کرتے ہیں، لیکن جاپان اور چین ان کے سرپرست ہیں؛ کیوں کہ ان ممالک میں یہ نہیں ہوتا۔ ان ہی پنڈت جی سے کسی نے عجیب سوال کیا تھا کہ مائی گنگا بھی تو معبود ہے، اس کو پیکر پیشاب بنانا کیوں جائز ہے، پھر یہی برتاؤ اگر کسی اور دیوتا کے ساتھ ہو تو اس میں کیا حرج ہے، سنا ہے کہ استفتا گیا ہے، معلوم نہیں کہ کیا جواب آئے۔

بہر حال ہمیں اس سے کیا بحث، ہم کو تو صرف یہ معلوم ہے کہ ہمارے آقا کو امامت کبری ملی۔ جس کا نتیجہ کوثر ہے، اس کے شکریہ میں نماز پڑھنا اور قربانی کرنا چاہئے اور دشمن کا معاملہ خدا کے سپرد کرنا مناسب ہے، اس کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی نسلوں کو کاٹ دے گا۔

انا اعطینک الکوثر فصل لربک وانحر ان شانئک هو الابتر. میں نے تمہیں کوثر عطا کیا، پھر اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر، تیرے دشمن ہی منقطع النسل ہیں۔

ماہنامہ القاسم دیوبند/ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

بقرعید۔یا۔عملی اسلام کا پہلا دن

الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله و الله اکبر الله اکبر ولله الحمد

توانائیوں کا وہی انمول ذخیرہ جنہیں انسانی توانائیاں کہتے ہیں،ان ہی سے آراستہ وپیراستہ ہوکر وجود کی اس محفل میں آدمی جس دن شریک ہوتا ہے،توہر سال کی اس تاریخ جس میں یہ سرفرازی اسے نصیب ہوئی،سالگرہ کے نام سے جشن مناتا ہے، بلاشبہ جشن ہی منانے کا یہ دن ہے؛لیکن جو پونجی دی گئی تھی زندگی کے کاروبار میں شریک ہونے کے بعد جو اسے بجائے بڑھانے کے گھٹاتا رہا ہے،تا آنکہ حساب و کتاب کے دن جب جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو کہ جاگنے کی گھڑیوں میں یہ ہمیشہ سوتا رہا اور کمانے کی جگہ کھوتا رہا،آسائش وآرام اور اپنے سکھ کا سامان جس سرمایہ سے چاہئے تھا کہ پیدا کرے اس سے صرف تنگی ومصیبت اورصرف دکھ کے انگارے بنتا رہا،تو بتایا جائے کہ اس سرمایہ کو لے کر جس دن آدمی دنیا میں قدم رکھتا ہے وہ دن بجائے جشن وعید کے کیا اسی واویلا کا سزاوار نہیں ہے جو اپنی پیدائش کے دن کے متعلق کہنے والے نے کہا:۔

"نابود ہوں وہ دن جس میں میں پیدا ہوا تھا اور وہ رات جس رات میں کہتے تھے کہ ایک لڑکا پیٹ میں پڑا،رحم ہی میں میں کیوں نہ مرگیا،پیٹ سے نکلتے ہی میں نے جان کیوں نہ دی،گھٹنوں نے مجھے کیوں لیا اور چھاتیاں کیوں ہوئیں جو انھیں میں نے چوسا،۔۔۔۔۔۔اے کاش!میرا دم نکل جاتا،آنکھیں مجھے نہ دیکھتیں،میں اس کے مانند ہوتا جو نہیں ہوا ہے اور پیٹ ہی سے قبر میں چلا گیا"۔

(کتاب ایوب)

پس سچی بات یہی ہے کہ جس دن آدمی اس دولت کو لے کر پیدا ہوتا ہے؛اگر

وہ جشن اور عید کا دن بن سکتا ہے اور اس دولت کے صحیح استعمال کا گُر آدمی پر جس دن واضح ہوا،ایسا گر کہ جن قوتوں کے غلط استعمال سے جہنم ہے،ان ہی قوتوں کا نرخ اس گُر سے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ صرف جنت ہی نہیں؛بلکہ جنت والا اور اس کی رضامندی بھی خریدی جاسکتی ہے اور

"یزداں بکمند آور ای ہمت مردانہ"

کا سینہ میں زور بندھنے لگتا ہے،تو دراصل انسانی توانیوں کے صحیح استعمال کے اسی گر اور معتمد حیات کے اسی حل کا نام "اسلام" ہے۔آج سے ساڑھے چار ہزار سال پیشتر اسی علم کا عملی تجربہ سال کے اسی مہینہ اور اسی مہینہ کی اسی تاریخ میں وادی مکہ یا بکہ کی ایک پہاڑی کے دامن میں دو باپ بیٹوں نے مل کر پیش کیا تھا اور جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

فلما اسلما و تله للجبين. جب دونوں باپ بیٹوں نے عملاً سچا اسلام پیش کیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر گرایا۔

تو ان دونوں باپ بیٹوں کے اسی عملی تجربہ پر پہلی دفعہ "اسلام" کے لفظ کا اطلاق کیا گیا،اسی لئے اسلام کے عملی تجربہ کے اس دن کو مقدس قرار دیا گیا ہے اور ہر سال جب وہ تاریخ آتی ہے تو انسانی قوتوں کی پیدائش کے دن کو نہیں؛بلکہ ان قوتوں کے صحیح استعمال اور ان قیمتوں کی آخری گراں قدری وگراں بہائی کا جس دن انکشاف ہوا اسی دن عید منائی جاتی ہے اور اسی شکل میں منائی جاتی ہے،جس شکل میں "اسلام" کے ان عملی تجربہ کاروں نے پہلی دفعہ اسلام کا عملی تجربہ پیش کیا تھا،اس وقت بھی ایک زندہ وجود دوسرے زندہ وجود کو پیشانی کے بل پٹک کر ذبح کرنے کے لئے ہاتھ میں چھری لئے کھڑا تھا اور آج بھی ٹھیک اسی شان کے ساتھ ایک زندہ دوسرے زندہ کے سامنے کارد بدست کھڑا ہوتا ہے،ان دونوں باپ بیٹوں نے ہرطرف سے نگاہ پھیر لی

تھی اور حتی کہ حسی طور پر بھی، بیٹا اسی لئے پیشانی کے بل زمین پر سر رکھے ہوئے تھا کہ باپ کے بوڑھے چہرے پر پیشانی والی آنکھ بھی نہ پڑے اور کہتے ہیں کہ باپ نے بھی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی، غرض دونوں ہر چیز سے ٹوٹ کر اسی میں ڈوب گئے تھے جس میں ڈوبنے کے بعد انسانیت پھر ہمیشہ کے لئے ڈوبنے سے محفوظ ہو جاتی ہے، مشاہدہ کرا کے دکھایا جا رہا تھا کہ بیٹے پر قطعاً ابراہیمؑ کے نزدیک بیٹے ہی پر چھری چلا دی گئی اور جو بیٹے پر چلی وہ باپ پر بھی چلی، اس لئے نہیں کہ وہ اس کا محبوب تھا؛ بلکہ بوڑھے ابراہیمؑ کے نخل وجود سے صرف ایک یہی تازہ شاخ تھی جو ننانوے سال کی عمر میں پھوٹی تھی، تو دیکھو بہ ظاہر یقیناً اس کو ذبح کر کے ابراہیمؑ نے اپنی پوری نسل ذبح کر دی اور یوں بیٹے کے ساتھ ساتھ باپ بھی ختم ہو گیا؛ لیکن اس وقت بھی دیکھا گیا اور چار ہزار سال سے دیکھا جا رہا ہے کہ نہ بیٹا ذبح ہوا اور نہ باپ ختم ہوا، مغرب ہو یا مشرق، ابراہیم کا، ابراہیم کی نسل کا پھریرا لہرا رہا ہے، پچاس کروڑ مسلمان ہوں یا ساٹھ کروڑ عیسائی، یا دس کروڑ یہودی، الغرض مشرق والے ہوں یا مغرب والے سب کے گھر میں ابراہیم کا پرچم بلند ہے، رہے گا قیامت تک اور قیامت کے بعد ابد تک:

ولقد اصطفینا فی الدنیا و انه فی الآخرة لمن الصالحین. اور ہم نے دنیا میں ابراہیم کا انتخاب کیا اور ''الآخرة'' میں بھی وہ ''الصالحین'' میں ہے۔

اور دیکھو کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے حلقوم پر چھری چلا کر جس نے طے کر دیا تھا کہ اپنے پیچھے کسی کو نہ چھوڑے گا اسی کو دیکھا گیا کہ

انی جاعلک للناس اماما . میں بنانے والا ہوں تجھے ''الناس'' کا امام۔
کے جھنڈے کے ساتھ قوموں اور امتوں کے آگے آگے ہے۔

بہر حال اسلام کے اس عملی تجربہ نے فانی ہونے والوں کو جب باقی بنا دیا، ایسا تجربہ جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا، تو اسی تجربہ کی سالگرہ میں لوگ یہ کیوں

تلاش کرتے ہیں کہ قربانی کرنے والوں نے آخر دیا کیا؟ نہ خدا کو گوشت دیتے ہیں، نہ قربانی کا لہو، حتیٰ کہ بہت سے مسلمان تو قربانی کی کھال سے سال بھر پہننے کے لئے اپنے جوتے بنوا لیتے ہیں، مشکیں تیار کر لیتے ہیں، گوشت کو بھی خود ہی کھا جاتے ہیں، احباب کو کھلاتے ہیں اور صرف ایک تہائی حصہ اپنے غریب ہم جنسوں میں بانٹتے ہیں اور یہی ان کے مذہب کا حکم بھی ہے، خود قرآن میں ''**لن ینال الله لحومها و لا دماء ها**'' (۱) کا کھلا اعلان موجود ہے، صحابہ بھی کہتے ہیں کہ قربانی کے جانور کی سری، پائے کو پندرہواڑوں، اور چربی کو مہینوں اپنے خانگی پکوانوں میں استعمال کرتے تھے۔

الغرض ابراہیم کو بھی بیٹا واپس مل گیا اور ان کی سنت کی پیروی میں جو بھی قربانی کرتا ہے اسے بھی اس کی قربانی واپس مل جاتی ہے، بلا شبہ واقعہ تو یہی ہوتا ہے، لوگ سوچتے نہیں ورنہ قربانی کا جو مقصود ہے اس کو نہ گوشت سے لگاؤ ہے نہ کھال سے، نہ ہڈی سے، قرآن نے اس مسئلہ کو اپنی عادت کے خلاف بڑے بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے، میں وقت کی تنگی کی وجہ سے ان مقاصد کی طرف اجمالی اشارات کر سکتا ہوں، تفصیلات آپ خود اس سے سمجھ لیں۔

نسک (یعنی قربانی) کی مستقل عبادت کو جو نماز، روزہ، حج، زکوۃ سب سے الگ اپنی ظاہری اور معنوی خصوصیتوں کی بنیاد پر الگ چیز ہے، نماز کا جز بنانا یا زکوۃ وخیرات کے نیچے اسے درج کرنا یا حج کا اسے ضمیمہ سمجھنا یہ سارے من مانے خیالات ہیں؛ بلکہ یہ قرآن کی عائد کی ہوئی ایک مستقل عبادت اور مستقل دفعہ ہے، قرآن نے اس عبادت کے اغراض جو بتائے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ساری نعمتوں میں جو قدرت کی طرف سے انسان کو اس مادی زندگی میں عطا ہوئی ہیں، ان میں سب سے اہم نعمت ''رزق'' ہے، آج سارے جھگڑے، سرمایہ

(۱) اللہ کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت اور ان کا لہو نہیں پہنچتا، ''ولکن یناله التقویٰ'' البتہ اس قربانی کی جو اصل روح ہے یعنی ''تقویٰ'' وہ خدا کے یہاں جاتا ہے اور اسی کی قدر و قیمت ہے۔

16

داری اورمزدوی کے اسی رزق معروف بہ ’’روٹی و پیٹ‘‘ کے سلسلہ کے ہیں، یہی ایک نعمت ہے جس میں فائدہ کے ساتھ آدمی کو لذت بھی ملتی ہے، سانس میں فائدہ ہے لذت نہیں اور دوسری لذتوں میں کچھ کھوئے بغیر لذت نہیں مل سکتی، پر قوت ذائقہ کے متعلقات ہی ایسی چیزیں ہیں جن میں لذت بھی ملتی ہے اور آدمی بجائے کھونے کے حاصل کرتا ہے؛ بلکہ جو کچھ حرارت غریزی کی وجہ سے کھوتا رہتا ہے اسے نئی شکلوں میں اسی راہ سے پاتا رہتا ہے، اب یہ سوال کہ انسانی قوت ذائقہ جن غذاؤں سے لذت اور قوت حاصل کرتی ہے ان میں سب سے لذیذ ترین اور قوی ترین غذا کیا ہے؟ جنھوں نے نہیں چکھا ہے ان سے معافی چاہتے ہوئے، میں اکثریت کے اس اتفاق کو پیش کرتا ہوں جو ’’**سید الطعام اللحم**‘‘ (سب کھانوں کا سردار گوشت ہے) کی حدیث کی توثیق کرتا ہے۔

پہلی بات یہی ہے کہ خدا کی نعمتوں میں سب سے بہتر نعمت اس زندگی میں آدمی کو جو ملی ہے، ساری مادی نعمتوں کا اسی کو نمائندہ بنا کر قربانی کے ذریعہ سے ہر سال حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔

لکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام. ہر امت کے لئے منسک (قربانی کا قانون مقرر رہے، تاکہ وہ یاد کریں اللہ کے نام کو اس صلہ میں کہ روزی پہنچائی ان کو ’’بہیمۃ الانعام‘‘ سے (الانعام مویشیوں کو کہتے ہیں ان مویشیوں میں بکرے، بھیڑ، گائے، اونٹ کا نام بہیمہ ہے (تمام اقسام کو یہ حاوی ہے)۔

کا یہی مطلب ہے کہ قربانی رزق کی نعمت کا شکریہ ہے، جس میں احساس نعمت کے لئے ’’**بھیمۃ الانعام**‘‘ کو نمائندگی دی جاتی ہے۔

اسی ذیل میں ضمناً اس اہم مسئلہ کے ایک عجیب حل کی طرف اشارہ کر دیا گیا

ہے، جس کے حل میں دنیا اب تک پریشان ہے، مطلب یہ ہے کہ زمین کے اس کرہ پر جو زندہ جراثیم سے بھری ہوئی ہوا میں سانس لیتے ہیں ان ہی جراثیم سے آباد پانی پیتے ہیں، تالاب اور باوڑیوں کا پانی کھیتوں میں پہونچا کر مچھلیوں کی زندگی تالابوں میں اور کیڑوں مکوڑوں کی زندگی کھیتوں کے سوراخوں اور درازوں میں ختم کرتے ہیں، ڈاکٹر یوس جن درختوں کے متعلق قسم کھا کر کہتے تھے کہ وہ روتے ہیں اور ہنستے ہیں، انہیں خوشی بھی ہوتی ہے اور رنج بھی، ان ہی درختوں کو کاٹتے ہیں، سکھ ہی کے لئے نہیں دکھ سے بھی بچنے کے لئے، کھٹملوں پسوؤں، مچھروں کو مسلتے ہیں، الغرض جو اس دنیا میں رہتے ہیں جس کے ہر قدم کے نیچے ’’ہزار جان‘‘ اور جس کے رہنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی ہوگا جس کا منہ کسی ذی حیات کا مذبح اور پیٹ کسی جانور کی قبر نہ ہوتو اس دنیا میں جانوروں کی ایذا رسانی کا مسئلہ یقیناً پیچیدہ بنا ہوا ہے، پیچیدہ اور سخت پیچیدہ، اسلام بھی قطعاً جانوروں کی ایذا رسانی کو حرام ٹھہراتا ہے؛ لیکن جہاں کا ہر قدم کسی نہ کسی جان کے لئے ٹھوکر بن جاتا ہے وہاں اس کا وہ حل جس پر موجودہ زمانہ کی خوردبینوں کو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے اور ان مشوروں کے متعلق یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی ایسی ہستی کی طرف سے نہیں ہیں جس کے علم سے نہ وہ چیزیں غائب ہیں جو نظر آتی ہیں اور نہ وہ جو نظر نہیں آتی ہیں یا جن کا جاندار ہونا نظر نہیں آتا ہے۔

بہر حال حسی اور عقلی طریقہ سے جو نہیں سمجھ سکتے کاش وہ اپنے اندر اس بصیرت کو پیدا کر لیتے جو انھیں بتا سکتی ہے کہ انسانوں کی طرح جانوروں میں ایسا نمک حرام کوئی نہیں ہے جو In the name of the crown کی آواز سے نہیں؛ بلکہ بسم اللہ اللہ اکبر (نام پر اللہ کے، اللہ جو سب سے بڑا ہے) کی آواز پر بصد جان قربان ہو جانے کو آمادہ نہ ہو جاتا ہو، اس آواز میں ان وفا شعاروں کو جو لذت ملتی ہے وہ تکلیف کے احساس پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ اس میں ہر وہ تکلیف جسے

تکلیف وایذا سمجھا جاسکتا ہے،قطعاکم ہوجاتی ہے،تو شاید ان کو معلوم ہو جاتا کہ ’’ایذا رسانی‘‘ جومسئلہ لاینحل بنا ہوا ہے،’’وجیٹیرین نان وجیٹیرین‘‘ دونوں کو ہی ایذارسانی کے اس پاپ سے چارہ نہیں؛لیکن اسلام نے اس کا حل پیدا کرلیا ہے، پھر یہ کچھ جانوروں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں،آدمیوں کے متعلق بھی حدیثوں میں ہے کہ اللہ کی راہ میں جوشہید ہوتے ہیں تلوار کی مار ان کو کھٹمل یا پسو کے کاٹنے سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی،قرآن نے نفیاً واثباتاً،دہرادہرا کر اس حکم کی جس شدت سے تاکید کی ہے اور جو ایذارسانی کے اس حل کے بغیر کسی جاندار کے ساتھ اذیت رساں فعل کا ارتکاب کرتا ہے اس کو قطعاحرام کردیا گیا ہے، اسی سے لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ ہوا کے ارتعاش کا کسی چیز کی حلت اور حرمت پر بظاہر کیا اثر پڑسکتا تھا،لیکن اسلام میں وہ موثر ہے اور قیمتی سے قیمتی چیزیں اس کے بغیر تاثیر ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مردار بتا کر پھکوادی جاتی ہیں، بہر حال’’**لیذکروا اسم اللہ**‘‘ کے اندر میرے خیال میں ذکر شکر کے ساتھ ساتھ اس حل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ہنسا اور ایذارسانی کے متعلق اسلام نے پیدا کیا ہے۔

یہ تو پہلی غرض تھی یعنی قربانی نعمتوں کے شکر کا ایک سالانہ جشن ہے۔

(۲) اپنے ہی جیسے زندہ گوشت و پوست جانور کو ملک کی مجازی صرف مجازی نسبت کی بنیاد پر آدمی جب اپنے کو اس کا قدرتی حقدار سمجھتا ہے کہ اس کی جان تک کو کام میں لاسکتا ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، ماس پارٹی والے ہوں یا گھاس پارٹی والے اس قدرتی حق کا حقدار سب ہی اپنے کو سمجھتے ہیں اور اس لئے سب ہی کو نفع اٹھانے یا ضرر سے بچنے کے لئے جان لینا پڑتا ہے اور سب لے ہی رہے ہیں، تو گذشتہ بالا الفاظ کے بعد:

فالھکم الہ واحد فلہ اسلموا. پس تمہارا اللہ ایک ہی اللہ ہے، بس اس کو سپرد کردو اپنے آپ کو یا جھک جاؤ اس کے لئے۔

فرما کر میرے خیال میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ قربانی کرنے والے کو پھر مالک کے مقابلہ میں کس طرز عمل کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانا چاہئے، مجازی مملوک جب مالک کے قدموں پر جان نثار کردیتا ہے تو حقیقی غلام ومملوک کو کیا کرنا چاہئے اور جب جانور اپنا سب کچھ مالک کے سپرد کرتا ہے تو آدمی یقیناً **اسلموا** کا زیادہ مستحق ہے۔

(۳) حقیقی مالک سے حقیقی مملوک کی اس نسبت کا نام’’اخبات‘‘ ہے قربانی کے وقت اس فرض کے احساس کو زندہ کرکے اخبات اور اسلام (یعنی سپردگی تام) کے جذبہ کو جو بیدار کرتے ہیں اور اپنے مالک سے وہ نسبت پیدا کرلیتے ہیں کہ صرف نام سننے کے ساتھ ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

بشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم. اور بشارت سنائیے ان نیازمندوں کو جن کی کیفیت یہ ہے کہ جب اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے قلوب سناٹے میں آجاتے ہیں۔

میں اسی کی طرف ایماء فرمایا گیا ہے، گویا ان کیفیات کا پیدا کرنا قربانی کی ایک غرض یہ بھی ہے۔

(۴) مجازی مملوک مجازی مالک کی چھری تک جب برداشت کرلیتا ہے قرآن اشارہ کرتا ہے کہ اسی سے تم اپنے دنیاوی مصائب کی تکلیف ہلکی کرسکتے ہو کہ جو کچھ تمہیں بھی پہنچ رہا ہے حقیقی مالک ہی کی طرف سے پہونچ رہا ہے۔

الصابرین علی ما اصابھم. صبر کرنے والے ان مصیبتوں پر جو انہیں پہنچتی ہے۔

میں قربانی کے اسی سبق کی طرف رہنمائی پائی جاتی ہے گویا دنیاوی مصائب و آلام کی اذیت کے احساس کی کمی کا ذریعہ بھی قربانی کی زندہ مثال کو بنانا چاہئے۔

(۵) مجازی مملوک کو جب بلایا جاتا ہے حاضر ہوجاتا ہے اور مجازی مالک کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہے تو حقیقی مملوک کو کیا کرنا چاہئے ،اس کے لئے:

والمقیمی الصلوۃ. اورقائم کرنے والے نماز کے۔

سے عبرت دلائی جاتی ہے۔

(۶) مجازی مملوک مجازی مالک کو اپنا سب کچھ سپرد کر کے اجازت دیتا ہے کہ جسے چاہئے مجھے میرے جس حصہ کو بانٹئے ،دیجئے ،دلایئے۔

الغرض قربانی ''منسک'' صرف ذبیحہ نہیں ہے، وہ توان شش گانہ اصول حیات کا ایک زندہ درس ہے،حق تعالی کی نسبت سے یہی کیفیت جب ''قلب'' پر طاری ہو جاتی ہے اسی کو''التقوی'' کہتے ہیں،قرآن نے اعلان کیا کہ خدا کوکوئی گوشت اورخون سے پکڑ نہیں سکتا،البتہ اپنی قربانی سے ان اسباق کی روح کو جذب کرنے والوں میں جوتقوی پیدا ہوتا ہے اسی سے خدا کو پکڑا جاسکتا ہے،''**ولکن ینا له التقوی منکم**''

(۷) قربانی کی آیت ختم کر کے

ان اللہ یدافع عن الذین آمنوا. قطعا ایمان والوں کی طرف سے خدا مدافعت کرتا ہے۔

کی آیت شروع ہوجاتی ہے،خدا اہل ایمان کی طرف سے مدافعت کرتا ہے،ظاہر ہے کہ خدا براہ راست تو مدافعت کرنے کے لئے آتا نہیں،اسباب ہی کے بھیس میں اس کی مدافعت آتی ہے،تو کیا قربانی سے مدافعت کی قوت بھی مسلمانوں میں پیدا ہوسکتی ہے؟ قربانی کے ساتھ ہی اس کا ذکر اپنے اندر ضرور اس کی طرف کچھ اشارہ (۱) کررہا ہے،عورتوں تک کو جب اسلام میں حکم ہے کہ اپنی قربانی کو ذبح کرتے ہوئے دیکھیں،

(۱) سورہ کوثر میں **فصل لربک وانحر** کے بعد متصلا **ان شانئک هو الابتر** کی بشارت سے بھی یہ اشارہ مفہور ہورہا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰؓ صحابی اپنی لڑکیوں سے خود ذبح کراتے تھے اور خود فاطمہ زہراؓ کو آنحضرت ﷺ حکم دیتے کہ اپنی قربانی کے خون کو جاکر دیکھو کہ ہر قطرہ خون ایک گناہ کی مغفرت کا ضامن ہے، سوچنے سمجھنے والوں کے لئے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جنہوں نے خون بہتے، لاشوں کو تڑپتے نہیں دیکھا ہے، اچانک میدان جنگ میں اگر گھر جائیں تو اس خونی نظارہ کی وہ تاب لاسکتے ہیں؟ پس ہر سال اس نظارہ کی مشق، حفاظت خود اختیاری اور مدافعت کا بھی ذریعہ ہے، اور قرآن میں قربانی کے متعلق اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

الغرض ''قربانی'' زندگی کے ان ہی مہمات اور مالک سے مملوک کے استحکام تعلقات کا ذریعہ ہے اسی لئے قرآن نے بتلایا

والبدن جعلنا ها من شعائر الله. اورقربانی کے جانور کو ہم نے اللہ کے شعائر میں بنایا ہے۔

بندے اور خدا کے باہمی تعلقات کے ''شعور'' کے بیدار کرنے کا وہ ذریعہ ہے یہی قربانی کی روح ہے، نماز ان روحانی اسباق کی کتاب کا مقدمہ ہے، جب قربانی کا عمل ہوگیا یعنی جن امور کا ''شعور'' مقصود تھا، ان کا شعور بیدار ہوگیا، اب اس کے گوشت کو

فکلوا منها واطعموا القانع والمعتر. کھاؤ اور جو نہ مانگیں ان کو بھی اور جو سامنے آکر مانگیں انھیں بھی اس سے دو۔

یہ ایک عام نیکی اور حسن سلوک کا حکم ہے، لیکن قربانی کی روح سے جو ناواقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کچھ پیسے خیرات کردینا بجائے قربانی کے زیادہ مفید ہوگا۔

کاش! وہ اس مستقل عبادت (منسک یعنی قربانی) کی حقیقت اور اس کے اسرار کو سمجھتے۔

ماہنامہ الفرقان بریلی/رمضان وشوال/۱۳۶۱ھ

شہادت حسنیٰ
یا ماہ محرم کی تجلی ریزیاں
کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا

ننھے بچے کی تربیت و پرورش کے لئے محسوس قوتوں میں سب سے بڑی قوت وہ ہے جسے باپ کہتے ہیں؛ لیکن کیا تماشا ہے کہ وہ بزور توڑ دیا گیا اور پیدا ہونے سے پیشتر ہی توڑ دیا گیا، وہ آیا اور اس شان کے ساتھ آیا کہ جس کو لوگ پالنے والا کہتے ہیں وہ مدینہ کے ایک میدان میں سویا ہوا تھا، سعد کے کنبے والو دوڑو! اور اس بچہ کو چھاتی سے لگاؤ، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔

جن کے پاس سب کچھ تھا انھیں ڈھکیل دیا گیا، جس کی اونٹنی کا تھن خشک ہو چکا تھا اور خود جس کے پاس دودھ کا ایک قطرہ نہ تھا، کچھ نہ تھا، اسی نے اپنی گود میں اٹھا لیا، جب واپس کرنے آئی تو تماشا کا یہ کیسا دردناک حصہ تھا کہ ابواء کے ایک جھونپڑے میں اس بچہ کی تربیت و پرداخت کرنے والی دوسری قوت بھی ہمیشہ کے لئے گم ہوگئی۔

پیر مرد، بوڑھا دادا اٹھتا ہے، اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے، لیکن قدرت جس کے ساتھ کچھ نہیں رکھنا چاہتی وہ اٹھتی ہے اور اس ہاتھ کو بھی جھٹک کر علٰحدہ کر دیتی ہے، اب کوئی نہیں، اس بچہ کا کوئی نہیں، اس کے پاس کچھ نہیں، ہاں! بہت سے چچا ہیں؛ لیکن جن کے پاس بہت کچھ تھا انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ان میں جو سب سے زیادہ نادار تھا اسی کے بچوں میں وہ بھی مل گیا، چچا نے نہیں، بلکہ بھتیجے نے بکریاں چرا کر اس کو کچھ دیا اور اسی میں سے کچھ خود بھی کھا لیا۔

الغرض ایک بچہ پیدا ہوتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے ساتھ نہ باپ کی قوت ہے نہ ماں کی قوت ہے، نہ اقرباء اور اعزہ کی قوت ہے، کوئی قوت نہیں ہے، حتی کہ وہ جس ملک میں پیدا ہوتا ہے، وہ بھی ہر قسم کی نباتاتی اور حیوانی قوتوں سے خالی ہے، میدان ہے اور چٹیل میدان ہے، اس کا نام بن کھیتی کا بیابان ہے، نہ اس کے آغوش میں ندیاں کھیلتی ہیں اور نہ دریاؤں کا شیریں پانی اس کو سیراب کرتا ہے، نہ سرسبز مرغزار ہیں، نہ نظر فریب گلزار ہیں، الغرض انسانی دل و دماغ کے سنوارنے اور ابھارنے میں جن قدرتی ذرائع کو دخل ہے ان میں سے بھی اس میدان میں کچھ نہیں ہے، وہ جس شہر میں پیدا ہوتا ہے، اس کے باشندوں کے پاس بھی کوئی قوت نہیں ہے، نہ ذہنی قوت، نہ سیاسی طاقت، نہ علمی زور، یعنی جن قوتوں پر قدموں کی تعمیر کھڑی ہوتی ہے وہ ہر ایک سے خالی ہیں، نہ وہ آئین رکھتے تھے نہ دستور، نہ ان کا کوئی بادشاہ تھا نہ ان کی جماعتی پراگندگیوں کا کوئی شیرازہ بند، نہ ان کے پاس مکاتب تھے نہ مدارس، نہ کارخانے نہ فیکٹریاں، کچھ نہیں ان چیزوں میں سے ایک بھی نہیں، جس میں داخل ہو کر کوئی بچہ پروان چڑھ سکتا ہو، ان کے پاس جو جسمانی طاقت تھی اس کا مصرف بھی بجز اپنی تعداد گھٹانے کے اور کچھ نہ تھا۔

اسی ملک میں، اسی شہر میں، اسی قوم میں اس بچہ کا ظہور ہوا اور اس شان کے ساتھ ہوا کہ اس کے سر پر جو قوت بھی سایہ فگن ہو سکتی تھی یا ہوتی تھی، وہ ایک ایک کر کے مٹا دی جاتی تھی، یہاں تک کہ آخر میں یہ بھی ہوا کہ وطن پر جو اسے بھروسہ ہو سکتا تھا اس بھروسہ کو بھی ہٹا دیا گیا، برادری والوں پر جو اعتماد ممکن تھا وہ بھی ناممکن کر دیا گیا، یعنی سارا وطن اور وطن والے، قبیلے والے، کنبے والے سب اس کی دشمنی پر متفق ہو کر آمادہ ہو گئے اور وہ جس کے پاس نہ باپ کی قوت تھی اور نہ ماں کی، نہ دادا کا زور تھا نہ اور کسی کا، نہ حکومت کی سرپرستی اسے حاصل تھی، نہ مدرسو کی تعلیم سے وہ فیض یاب ہو

سکتا تھا، نہ اپنے ملک کے گرد وپیش کے خنک آمیز اثرات سے اپنے دماغ کو تازگی اور اس میں بالیدگی پیدا کر سکتا تھا، اب اس کے ساتھ یہ بھی کیا گیا کہ گھر والے، کنبے والے، قبیلے والے، وطن والے سب کے سب اس سے علحدہ ہو گئے یا وہ ان سے علحدہ کر لیا گیا اور اب جا کر یہ ارادہ پورا ہوا کہ دیکھو!

''اس کے پاس کچھ نہیں ہے''

وہ ساری قوتیں جن کو لوگ ''قوت'' کہتے ہیں اور جن کا نام محسوس پرستوں کی اصطلاح میں ''قوت'' ہے ''زور'' ہے، ایک ایک کر کے الگ کر لیا گیا، اس کے بعد دکھایا گیا، مشاہدہ کرایا گیا کہ

''جس کے پاس کچھ نہیں ہے، دیکھو! کہ اس کے پاس سب کچھ ہو گیا''۔

ایک منظر وہ تھا اور دوسرا منظر یہ ہے کہ وہ زمین کے ایک بڑے قطعہ کا مالک ہے، اس کے خادموں؛ بلکہ خادموں سے نیچے اگر کوئی درجہ ہو سکتا ہے وہی قیصر کی ٹوپی اچھال رہے ہیں، کسریٰ کی جلال وجبروت کے پرزے اڑا رہے ہیں، وہی جس کے پاس کچھ نہ تھا، کیا دنیا نے نہیں دیکھا یا نہیں دیکھ رہی ہے یا نہیں دیکھے گی، کہ وہی دنیا میں سب سے بڑا اقرار پایا، قومیں اس کی تقدیس میں مصروف ہیں، نسلیں اس کے سراہنے میں منہمک ہیں، افغانستان کی پہاڑیوں میں، مراکو کی وادیوں میں، مصر کے ایوانوں میں، ہندوستان کی بستیوں میں، چین کی آبادیوں میں، افریقہ میں، ایشیا میں، یورپ میں، امریکہ میں، کون ہوا؟ اتنا بڑا کون ہوا؟ صرف ہمارے پاس نہیں، ہماری تاریخ میں نہیں، دوسروں کی تاریخ میں، کیا اس سے بھی اونچا انسان نسل اول میں کوئی ظاہر ہوگا، مامون و ہارون کو کس کی غلامی پر ناز تھا؟ صلاح الدین ایوبی کس کے نام پر صلیب والوں کی بھیڑ میں لرزا ڈالتا تھا؟ محمود کس کی جوتیوں کے صدقہ میں مشرق کا اولوالعزم فاتح قرار پایا؟ شاہ جہاں کس کے نام کی تسبیح پڑھتا تھا؟ عالم گیر کس کی نگاہ کرم کے لئے

دکن کے سنگستانوں میں سالہا سال تک ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا؟ یہ کس کی ہمنامی کی برکت تھی کہ اناطولیہ کا ترک قسطنطنیہ کی دیواروں کو پھاند گیا، یہ کیا تھا؟ اس نے دعویٰ کیا تھا اور یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا کہ محسوس قوتوں کا انکار کرے اور جو قوت غیب میں چھپی ہوئی ہے نظام کائنات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرے، اس نے دعویٰ کیا اور نہایت بلند آہنگی سے دعوی کیا اور خود اس کی دلیل بن کر دنیا کے سامنے آیا؛ کیوں کہ قیاسی حجتوں کا زمانہ نکل چکا تھا، مشاہدات اور تجربات کا وقت آرہا تھا، پس اس عہد کے جو پیغمبر تھے صلی اللہ علیہ وسلم ان کا دعویٰ بھی تخمینی مقدمات سے نکالے ہوئے نتائج پر مبنی نہ تھا؛ بلکہ کھلا ہوا تجربہ، صاف اور واضح مشاہدہ پر اس کی بنیاد کھڑی کی گئی، دنیا نے دعویٰ کو سنا اور دلیل کو دیکھا، پھر ان میں کس کے ہوش قائم رہے، کلیسا میں تزلزل پیدا ہوا، لوتھر نے ایک ضرب شدید سے پوپی تنظیم کی بنیادوں کو ہلا دیا، وہ خود بنایا نہیں، لیکن قصر تثلیث کے ایک اہم حصہ کو اس نے اپنے ہاتھوں برباد کر دیا، کیا کوئی اس کا منکر ہو سکتا ہے، کہ تثلیث کی یہ جزئی شکست اسی دعویٰ اور دلیل کا نتیجہ نہ تھا جس کی ابتداء عرب سے ہوئی اور کیا ان ہی میں جو یونیٹی پر آج خطبہ دے رہے ہیں وہ عالم کے اس سب سے بڑے انسان کے احسان سے سبکدوش ہو سکتے ہیں، شراب پر احتساب قائم کرنے والوں! دیکھو حق سے آنکھیں نہ بند کرو، ترکستان میں کبیر کیوں پیدا ہوا، نانک کس دباؤ سے بے چین ہوا، رائے موہن رائے کس کی گرفت سے مضطر تھا اور آج ہندوستان کے طول وعرض میں جو وہ جماعت نظر آتی ہے جسے اسلام سے عداوت کا دعوی ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ وہ بت شکنی میں بھی مصروف ہے، کیا اس عملی فرماں بردار اور ذہنی نافرمان فرقہ کو اس ''دعویٰ'' کے اثر سے آزاد کہہ سکتے ہیں؟ دیانندیوں کو ذرا گریبان میں منہ ڈال کر غور کرنا چاہئے۔

لیکن اثبات دعویٰ کا ایجابی پہلو تھا، یعنی اس وقت تک یہ دکھایا گیا کہ

''کچھ نہ تھا اور سب کچھ ہو گیا''

مگر اثبات دعویٰ کا دوسرا رخ ابھی تشنہ تھا، ایجابی پہلو کا مشاہدہ ہو گیا اور کامل طور پر ہوا؛ لیکن اسی کا سلبی پہلو، یعنی

''سب کچھ تھا اور کچھ نہ ہو''

دل چاہتا تھا کہ اس کا بھی معاملہ کرا دیا جاتا تو پھر حجت تام ہو جاتی، شک و ریب کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، ایجابی پہلو کا تماشا تم نے مکہ کے وادی میں کیا، اب آؤ کربلا میں آؤ اور دیکھو کہ اس دعویٰ کی دلیل کا سلبی طور پر کس طرح مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔

محسوس قوتوں میں سب سے بڑی قوت سلطنت کی ہے، ہم جس رقبہ کے بادشاہ ہیں، اس علاقہ میں ہم سے بڑی قوت والا کون ہو سکتا ہے اور بادشاہوں سے تو رعایا کے کسی نہ کسی فریق کو کچھ نہ کچھ خصوصمت بھی ہوتی ہے، یہ قوت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب بجائے شاہی کے شاہزادگی کا طرہ میرے سر پر لہرا رہا ہو، کہ شہزادہ رعایا کے لئے صرف مایۂ امید اور بضاعت توقعات ہوتا ہے، ہر شخص اس کی خوشامد میں اس لئے منہمک ہوتا ہے، کہ آئندہ چل کر اس کی نگاہ کرم کا وہ مورد بنے؛ لیکن شاہوں کی شہزادوں کی حکومت تو صرف اجسام پر ہوتی ہے اس پیر یا مرشد کی قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو لوگوں کے جسموں پر نہیں؛ بلکہ قلوب پر حکومت کرتا ہو۔

اور پیری کا درجہ اس وقت کس قدر بلند ہو جاتا ہے جب وہ نبوت کی شان میں ظاہر ہو، یہ دنیا کی چوٹی کی قوتیں ہیں جنہیں ہم زور کہتے ہیں، اس سلسلہ میں کوئی طاقت ان طاقتوں سے بالاتر نہیں، پھر اس شخص کی قوت کی سوچو جو شہزادہ بھی ہو اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا شہزادہ ہو؛ کیوں کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بقول جرجی زیدان کرہ زمین پر سب سے بڑی قوت دو ہی تھی، رومی دولت اور

ایرانی سلطنت، جس قوم نے ان دونوں قوموں کو توڑ دیا، اس نے ساری زمین کی قوت توڑ دی اور اس لئے میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں اسلام دنیا کی سب سے بڑی قوت تھی، وہ اسی سلطنت کا شاہزادہ تھا، جہاں باغی رہتے تھے وہاں جاتا تو شبہ کی گنجائش تھی، وہ شام نہیں بلکہ عراق آیا جو اس کے پدر بزرگوار کا پایہ تخت تھا، کوفیوں کے پاس آیا جو اس کے والد کے نمک خوار سپاہی تھے اور صرف شہزادہ نہیں بلکہ وہ ان کا پیرزادہ بھی تو تھا، کیا ان میں ہر ایک اس کے والد کرم اللہ وجہہ کو اپنا روحانی پیشوا نہیں جانتے تھے؟ کیا اس کی والدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ان کی نگاہوں میں سیدۃ نساء العالم نہیں تھیں؟ اور صرف پیرزادہ ہی تو نہیں وہ ان کا نبی زادہ بھی تو تھا اور کیا نبی زادہ کو اس کے جدامجد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ان کے قلوب میں کسی مخلوق کی عظمت کی گنجائش نہیں تھی۔

الغرض امام حسین علیہ السلام جس وقت کربلا تشریف لائے ہیں تو کون انکار کر سکتا ہے کہ اس وقت وہ شہزادے بھی تھے، پیرزادے بھی تھے، نبی زادے بھی تھے، اور خود ان کے تقویٰ و ورع، زہد و صفا کی عام دھاک دنیائے اسلام پر قائم تھی، ان قوتوں کے ساتھ وہ آتے ہیں اور اپنے والد کے پایہ تخت میں آتے ہیں، اپنے والد کی فوج میں، ان کی چھاؤنی میں آتے ہیں، سوچنا چاہئے کہ قوت کی اتنی جہات کسی ایک شخصیت میں آج تک جمع ہوئی ہیں یا ہو سکتی ہیں۔

میں نے معمولی پیرزادوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ اس شہر یا گاؤں میں داخل ہوتے ہیں جہاں ان کے والد کے کل باشندے نہیں؛ بلکہ بعض لوگ مرید ہوتے ہیں تو پھر ان کو ان مریدوں کی قوت پر جو ناز ہوتا ہے شاید شہزادوں کو بھی اپنے ممالک محروسہ میں نہیں ہوتا۔

لیکن یہاں شہزادگی بھی ہے، پیرزادگی بھی ہے اور نبی زادگی بھی ہے اور دنیا کی سب سے بڑی قوت کی طرف سے امتیازات قدرتی طور پر ان کو حاصل ہیں۔

الغرض عالم محسوس میں جو کچھ ممکن ہے

''سب کچھ ہے''

مگر اثبات دعویٰ کے اس تجربی پہلو کا مشاہدہ کرو، جس کا نام میں نے ''سلبی شہادت'' رکھا ہے کہ با ایں ہمہ قدرت وقوت، زوروطاقت، دنیا نے دیکھا، آسمان نے دیکھا، زمین نے دیکھا اور قیامت تک دیکھتی رہے گی کہ:

''کچھ نہ ہوا''

امام علیہ السلام شہید ہوگئے، ان کی نعش مبارک پامال ہوئی، ان کا سرمبارک کاٹا گیا۔ سچ یہ ہے کہ محسوس قوتوں، عقلی وسیلوں، خودساختہ ذریعوں کو امام حسین علیہ السلام کے پاک خون نے جس طرح دھو کر دنیا سے ناپید کیا، کسی نے نہیں کیا۔

اے شاہی جلال! تو بھی بے کار ہے، اے شاہزادگی! تیرے اندر بھی کچھ نہیں، اے پیرزادو! سوچو! ان بستیوں میں پہنچ کر سوچو! جہاں تمہارے خاندانی مرید رہتے ہیں کہ ان محسوس قوتوں کی تہ میں نفی اور عدم کے سوا کچھ نہیں ہے، جو قوت محسوس ہو رہی ہے وہ کچھ نہیں ہے اور جو نہیں محسوس ہوتی وہی سب کچھ ہے، "**لا حول ولا قوۃ الا باللہ**" **توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء**" کے دعاوی کا اثبات عملی اور تجربی شکل میں نانا صلی اللہ نے اپنی ابتدائی زندگی سے دیا اور نواسہ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں بھی صرف اسی کا مشاہدہ کرایا، کیا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے یہ غلط لکھا ہے کہ جو صورۃً کسی کے ساتھ مشابہ تھا وہ معنیً بھی اسی کے فرائض کی تکمیل کرکے دنیا سے روانہ ہوا۔

اللھم صلی علی محمد و علی آلہ کما صلیت علی ابراھیم و علی اٰل ابراھیم انک حمید مجید.

امامت کبریٰ:

خلیل علیہ السلام نے بھی قربانی دی تھی اور بلاشبہ ان کی قربانی کامل تھی؛ لیکن پھر بھی اس کا اثر باطن سے ظاہر تک متجلی نہ ہوا، دیکھو! اس کے صلہ میں جو انعام **انی جاعلک للناس اماما** کے ذریعہ بشکل ''امامت کبریٰ'' عطا ہوا اس میں ظہور کی شان کس قدر مخفی رہی، یہ سچ ہے کہ عیسائی، یہودی، مسلمان جو دنیا کی سب سے زیادہ مشہور قومیں ہیں، وہ ابراہیم کو اپنا امام مانتی ہیں اور پارسیوں کا بھی دعویٰ ہے کہ ان کا دخشور اول (پیغمبر اول) وہ شخص تھا جس نے خانہ کعبہ کی بنیاد ڈالی، ہندو بھی کہتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا رشی براہما تھا، اسی کے منہ سے جو بات نکلی ہم اس کو وید کہتے ہیں، جیسا کہ بعض کہتے ہیں کہ ہندوؤں کا براہما وہی ہے جسے تورات میں ابرام اور ابراہام اور قرآن میں ابراہیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور صحف ابراہیم جن کا سراغ قرآن سے تو ملتا ہے؛ لیکن دنیا میں نہیں ملتا، اس شکل کے ساتھ بھی نہیں ملتا جس شکل میں تورات وانجیل وزبور ہے ممکن ہے کہ ترجمہ در ترجمہ ہوکر وید کی ممسوخ ومنسوخ شکل میں وہی صحیفے موجود ہوں اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے، تو مؤرخ کے لئے یہ کس قدر مشکل ہے کہ بدھ کی تعلیمات کا سرچشمہ وید کو قرار دے، بہرحال مجھے اس وقت اس سے بحث نہیں، میں تو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا اثر باطن سے ظاہر تک متعدی نہ ہو سکا، اس لئے ان کی امامت میں بھی ظہور کا رنگ بہت ہلکا رہا جو ان کو مانتے ہیں، وہ براہ راست نہیں مانتے، اور جو نہیں مانتے دوسروں کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید ان ہی کو مانتے ہیں، یہ تو منی کی قربانی کا اثر تھا۔

پھر جو قربانی کربلاء میں ہوئی، وہاں باطن نے ظاہر کی، حقیقت نے مجاز کی شکل میں ظہور کیا، مینڈھا نہیں؛ بلکہ خود امام حسین علیہ السلام ذبح ہوئے، خدا کے سامنے ذبح ہوئے اس کی ساری قوتوں کے سامنے ذبح ہوئے، ملائکہ روحانیین اور ارواح مقربین کی

آنکھوں کے نیچے ذبح ہوئے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ذبح ہوئے، دوسروں کے ہاتھ سے نہیں، اپنے نانا کی امت کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

ان نکات کو سمجھ سکتا ہے کہ یرموکیوں کے پاس حسین علیہ السلام کی شہادت کے لئے کوئی نیزہ نہ تھا، قادسیہ کے کافروں کی کمر میں اس فضیلت تک پہنچانے کے لئے کوئی خنجر نہ تھا، کیا مصلحت تھی، جس کے حکم کے سوا اور کسی کا کوئی حکم نہیں، اس کی کیا مرضی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند علیہ السلام ذبح ہوں اور ان ہی کی بنائی ہوئی جماعت کے ہاتھوں سے ذبح ہوں، تاریخ میں جو یہ مرقوم ہے کہ جب امام علیہ السلام نے دریافت کیا کہ دشمنوں کا کیا حال ہے تو بالاتفاق آپ کو خبر سنائی گئی کہ

"اے امام! قلوب آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہاتھ آپ کے خلاف میں چلیں گے"

یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید کی حکمت مطلقہ میں جو سوچتے ہیں، وہ پاتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دل اپنے بچے کو ذبح کرتے وقت مضطر نہ تھا؛ اگر مضطر نہ تھا، تو پھر ان کے لئے اجر کیا تھا؟ مضطرب ہوا اور مضطرب نہ ہو ساری بنیاد تو اسی پر ہے، ورنہ گائے اپنے جوان بچے کو جسے وہ پہچان بھی نہیں سکتی؛ اگر اس نے اپنے سینگ سے مار ڈالا تو اس کے لئے کیا اجر ہے؟

بہرحال کربلاء میں جو قربانی دی گئی، یہی ایک ایسی قربانی تھی جو باطن سے منتقل ہوکر ظاہر کے پردہ پر جلوہ پرداز ہوئی، جو اندر تھا وہی باہر بھی آ گیا، حقیقت نے مجاز کو بھی حقیقت ہی کے رنگ میں رنگین کیا، اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ اس قربانی والی امامت کبریٰ جیسا کہ باطن میں عام تھی، تام تھی، اسی طرح ظاہر میں بھی عام ہوئی، تام ہوئی۔

اس امامت والے امام کو **کافۃ للناس بشیرا و نذیرا** کی سند دی گئی، تا کہ سب جانیں، سب مانیں اور پھر اس سند پر ختم نبوت کی مہر لگائی گئی، تا کہ براہ

راست جانیں، براہ راست مانیں، درمیان میں کوئی واسطہ حائل نہ، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی امامت کی شناخت میں لوگ وسائط و ذرائع کے محتاج ہیں، یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے، عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے، مسلمانوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کی امامت کے آگے گردنیں خم کیں، لیکن اس امامت کے لئے کسی واسطہ کی ضرورت نہیں، کسی ذریعہ کی حاجت نہیں، کیوں کہ اس کے بعد واسطوں کی پیدائش ہی بند کر دی گئی۔

اگرچہ اس کا تصفیہ کون کرسکتا ہے، کہ ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو امامت ملی، کیا وہ بھی اسی امامت کی ایک شان نہ تھی جس کی بشارت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی، جو بیٹے کو ملا کیا وہ باپ ہی کو نہ ملا، پھر اسی طرح ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ کربلاء میں جو شہید ہوا، وہ بھی اسی ذبیح کا ایک جزو تھا، جس کو منی کے ایک گوشہ میں ذبح کرنے کے لئے خلیل علیہ السلام نے پچھاڑا تھا، اسماعیلؑ نہیں شہید ہوئے، تو حسین علیہ السلام جو اسحاقؑ کے نہیں؛ بلکہ اسماعیلؑ ہی کے بچے تھے، کیا ان کی شہادت کو اسی مبتدا کی ہم خبر کہہ سکتے ہیں؟ عارفوں کے لئے ان اسرار میں کتنے لذائذ ہیں، جو پھل پیدا کرنے کے لئے سمندر سے ابخرے اڑاتا ہے، بادلوں کو جنبش میں لاتا ہے، مٹی کو لکڑی اور پتے اور آخر میں پھول کی شکل میں نمایاں کرتا ہے، جو آدم کو خلیفہ بنانے کا ارادہ پہلے کر لیتا ہے اور پھر ایک الزام سے ملزم بنا کر اپنے مقصد کو پورا کرتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا کیا کرتا ہے اور کن اغراض کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

جس کے ابوین صالح تھے، موسیٰ وخضرؑ کو حکم ہوا کہ ان کے خزانے کی حفاظت کریں، تا کہ باپ کی چیز بیٹے کو مل جائے، یہی ہوتا رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔

ردامانت:

''نہ تھا نیل کا جبار کچھ نہ تھا''، اس میں ''ہونے'' کی نمائش ہوئی، وجود ملا، وجود کے لوازم ملے، زندگی ملی، قوت دید ملی، شنید ملی، چشید ملی، شمید ملی، گوشت اور ہڈی کے مرکب میں ان طاقتوں کی جلوہ نمائیاں شروع ہوئیں، اس کی پیٹھ مضبوط کی گئی، اس کے بازوں میں زور بھرا گیا، اس کی زبان میں کہربائی اثرات دوڑائے گئے، وہ افریقہ کے اس سرسبز گوشہ کا سورما قرار پایا، اس نے سونے کا تخت بچھایا اور اس پر بیٹھ کر اس نے محسوس کیا، کہ ملک مصر کی گردش اسی کے ارادہ اور مرضی کے نقاط پر ہوتی ہے، یہ کیا احساس تھا، کہ اس نے اس کے دماغ کو الٹ دیا، اسے جو کچھ دیا گیا تھا اور محض مد امانت میں دیا گیا تھا، نظام دماغی کے معکوسی اثر کا ندازہ کرو، کہ وہ یکا یک یہ باور کرنے لگا، کہ اسی نے سب کو دیا ہے اور اس کا دینے والا کوئی نہیں ہے، خود فراموشی نے خودی کا رنگ اختیار کیا، اور خیانت کے جنون میں بدمست ہو کر وہ **انا ربکم الاعلی** بڑبڑانے لگا، جو ایک سکنڈ کے لئے بھی اپنی ذمہ داری پر، اپنے پھیپھڑے کو ہلکی سی سانس نہیں دے سکتا تھا، ایک بڑے ملک کے باشندوں کا ان کے کھانے پینے، سونے جاگنے، مرنے جینے، نفع نقصان کا ذمہ دار بن بیٹھا اور اپنے کو ہر قسم کی ذمہ داری سے اس نے بالاتر قرار دیا، اس کی شخصیت پر وہی آسیب مسلط ہو گیا تھا، جو آج کل بنی آدم کی بعض نسلوں کا گلا پکڑے ہوئے ہے، وہ انفرادی فرعون تھا، اور آج کرۂ زمین پر اجتماعی اور قومی فرعون کا بروز ہوا ہے، پہلے اس اژدہے نے نیل کے پانی سے سر نکالا تھا اور آج افراد کو مٹا کر ذرا زیادہ شدت کے ساتھ جمہوریت کی شکل میں ٹائمز اور سین کے کنارے گرج رہا ہے، دونوں کے اسپرٹ ایک ہے، سانچوں اور قالبوں کے اختلاف پر اتنا زور نہ دیا کرو، اس کی شکایت نہیں ہے کہ انہیں وجود کیوں ملا، ان کی نیستی میں ہستی کی منور شعائیں کیوں چمک رہی ہیں، ان میں بینائی، شنوائی کے مظاہر

کا ظہور کیوں ہوا، زمین پر ان کا رعب کیوں قائم ہے، جانی اور مالی نقصان کے خوف سے دنیا والے ان کو اپنی آمدنی کے ایک حصہ کو دینے پر کیوں مجبور ہیں، یہ خوف جن آلات واسلحہ کے زور سے پیدا ہوتا ہے وہ ان کو کیوں ملے؟

آخر ہم اس کا گلہ کیوں کریں؟ کیا ہم دبنے والے کے ملک میں ساجھی ہیں، یا اس کا ہم سے کوئی ناطہ ہے، ہم پر اس کے حقوق ضرور ہیں؛ لیکن اس پر کون حق قائم کر سکتا ہے، اس نے تمہارا کیا دیا جو تم اس طرح روتے اور آنکھیں بسورتے ہو، اپنی چیز دی ہے، اپنی قوت دی ہے، اپنا ساز وسامان دیا ہے، کیا واقعی ہمیشہ اس کی مصلحت وہی ہوتی ہے جو اس نادان بڑھے کے نزدیک تھی، اور کہتی تھی کہ ''اے خدا! مجھے دے اور میرے بیٹے کو دے، لیکن کیا دوسروں کے لئے تو قرض کرے گا''۔

ہم جس پر متعجب ہیں اور یہی تعجب کبھی غصہ کی اور کبھی تعصب کی، کبھی عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ یہ دیوانے اپنے کو، اپنے علمی اور عملی ذخیروں کو اپنا کیوں سمجھتے ہیں، امانت میں خیانت کیوں کر رہے ہیں۔

مجرم سے انسانی فطرت بیزار ہوتی ہے، چور کو کون دوست رکھتا ہے، ڈاکوؤں سے کسے عداوت نہیں، خود مجرم بھی تو اپنے جرم سے راضی نہیں، اپنے جرم کے وصف عنوانی سے موصوف ہونے کو اپنی اہانت خیال کرتا ہے، جو زانی ہے اس کو زانی کے خطاب سے مخاطب کرو اور بشری جذبہ کی طبعی مدافعت کا اندازہ کرو، کم از کم اپنی محافظت کے لئے تم کو تعبیر کے بدلنے پر مجبور ہونا پڑے گا، جس طرح آج یورپ قبائح وسیئات کی حرارت کو محاسن وحسنات کی خوبصورت عنوانوں اور تعبیروں سے ٹھنڈی کرتا ہے، پھر اگر ہم خائنوں سے کڑھتے ہیں، ان کی ہر حرکت وسکون سے ہمیں نفرت ہے، تو کیا سلیم فطرت اس کے سوا اور بھی کچھ کر سکتی ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ انھوں نے ہم سے ہمارا ملک لیا ہے، ہماری دولت لی ہے،

ہماری شوکت لی ہے، اس لئے ہم ان سے بیزار ہیں، جو ملک کو اپنا ملک اور دولت کو اپنی دولت سمجھتے ہیں، ہوسکتا ہے وہ ایک دوسرے سے اسی لئے چڑھتے ہوں۔

لیکن ہم سے تو ترکوں نے پٹھانوں نے، مغلوں نے اور خدا جانے کن کن لوگوں نے دولت بھی لی، سلطنت بھی لی، سب کچھ لیا، پھر کیا ہم میں کوئی اس وقت تک ان سے بیزار ہوا، جب تک کہ ہم نے اپنے کو اپنا نہیں سمجھا۔

بہر حال میں کہاں سے کہاں نکل گیا، میری غرض تو یہ تھی کہ مصر کے محدود رقبہ میں جس کے پس پشت قوت کی نمائش ہوئی تھی اور جس کے غلط انتساب نے غلطیوں کا انبار قائم کر دیا تھا، کیا تماشا ہے؟ وہ اس کو واپس نہیں کرنا چاہتا تھا؛ لیکن یکا یک سب کی سب واپس لے لی گئی، پانی کے باہر اس کا سب کچھ تھا؛ مگر چند قدم کے فاصلہ سے پانی کے اندر اس کا کچھ نہ رہا، اور

کم ترکوا من جنت و عیون و زروع و مقام کریم و نعمة کانوا فیھا فاکھین. اور کتنے باغ، کتنے سرچشمے اور کتنے پرشکوہ بنگلے اور وہ ساری نعمتیں جن میں وہ مزے لے رہے تھے، چھوڑ بیٹھے۔

ان چیزوں کو امانت سمجھ کر اس نے صاحب امانت کی طرف خود نہیں لوٹایا؛ بلکہ اس سے زبردستی یہ چیزیں چھینی گئیں، پھر کیا اس دردناک سانحہ پر کوئی رویا، کسی دل میں افسوس کا جذبہ ابھرا، ان پر کسی نے آنسو بہائے، ان کے لئے کون چیخا، یہ سچ ہے کہ آج جو اس کے گدی نشین اور اس کے دماغی مرض کے وارث ہیں، وہ اسکی اور اس کے آباء واجداد، اس کے امراء وزاراء کی قبروں کی جستجو میں سرگرداں ہیں، خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو جو زندہ اجسام کی اعانت کے لئے دی گئیں ہیں، وہ مردہ لاشوں کی تلاش میں صرف کر رہے ہیں، مصر میں مردوں کو ٹٹولا جاتا ہے اور زندوں کی گردنیں مروڑی جاتی ہیں اور جس طرح نوحؑ وابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ کے وارثوں نے اپنے بزرگوں کے

نام بلکہ کام سے معمورۂ عالم کو بھر دیا ہے، اسی طرح یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان گمنام، ملعون مورثوں کے سیاہ کارناموں کو علی الرغم روشن کریں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بڑے تزک واحتشام سے ہو رہا ہے؛ لیکن خدارا بتاؤ کہ ان میں سے ان ڈوبنے والوں کی لاش پر کون رویا، ان کی اونچی محل سراؤں پر کون آبدیدہ ہوا، ان کی فراواں دولت کے ڈھیر پر کس نے دہاڑیں ماریں، تم دیکھو! یا نہ دیکھو! لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے بزرگوں کی لاشوں سے یہ مداری کے بندروں کا کام لیتے ہیں، میوزیم مین کہتے ہیں، ٹکٹ لگاتے ہیں، پیسے وصول کرتے ہیں، ان کے کفن کے ساز وسامان کے چرانے میں ایک دوسرے پر کتے کی طرح غراتے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خائن مجرم تھا، مجرم نے جرم کی سزا پائی، پھر اس پر کون رو سکتا ہے **صدق مولانا الکریم.**

فما بکت علیھم السماء والارض (حق سبحانہ وتعالی) پھر نہ ان پر آسمانوں نے گریہ کیا اور نہ زمین روئی۔

لیکن اس کے مقابلہ میں جو فرات کے ساحل میں آیا، اپنے کو لے کر آیا، اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو لے کر آیا، اپنی قوتوں کو لے کر آیا، اپنے تمام اعضاء کو لے کر آیا، اپنے بال بچوں کے سمیت آیا، اپنی عزت وآبرو اپنے ناموس کو لے کر آیا، اپنی شاہزادگی کی طاقت، پیرزادگی کے اعتماد کو لے کر آیا، اپنی نبی زادگی کے جلال کو لے کر آیا؛ بلکہ خود اپنے زہد وتقوی، ولایت وکرامت کی قوتوں کو لے کر آیا، زبردستی نہیں؛ بلکہ راستی سے آیا، خوشی سے آیا، روکنے والوں نے روکا؛ لیکن وہ بے تحاشا ردامانت کے لئے امتحان کے میدان میں، جانچ کے دنگل میں اتر گیا، کیا وہ شامیوں کے فلزاتی تخت کے لئے اترا، بنی امیہ کے پاس مٹی کی بالائی سطح کا جو چھلکا تھا، کیا وہ اس کے لئے آیا، کیا واقعی اس کے سامنے ابن زیاد تھا یا یزید کا سپہ سالار تھا،؟ لوگ کچھ ہی سمجھیں؛

لیکن عارفوں نے دیکھا تھا اور جیسا کہ تاریخوں میں بھی ہے، کہ وہ صف جنگ میں

"لا اله الا الله سبحان الله و بحمده"

کا نعرہ لگا رہا تھا، پس کون جان سکتا ہے کہ کس لئے آیا تھا اور کس کے سامنے آیا تھا اور یہ لین دین کن دو ہستیوں کے درمیان تھا، اس پر پانی بند کیا گیا، اس کے خشک ہونٹ، سوکھی زبان اس کی کب تھی جو پروا کرتا، اس سے اعزہ کی گردنیں مانگی گئیں، اس نے واپس کر دیں، اس سے ننھے بچوں کا خون طلب کیا گیا، اس نے حاضر کر دیا، اس پر تیروں کی بارش ہوئی اس نے قبول کیا، اس کا جسم چھیدا گیا، وہ دم بخود کھڑا رہا، اس کے جسم پر تلواروں کی دھار ماری گئی وہ سر جھکائے کھڑا تھا اس کے سر سے گردن الگ کی گئی اور اس خدا کے سامنے الگ کی گئی جو اس کے ساتھ تھا، پھر کیا اس نے انکار کیا، اس کے گھر کے ادنی خادم مغسول ملائکہ تھا، فہیرہ بن مالک کی لاش کو ملکوت والوں نے چھپالیا؛ لیکن اسی گھر کا جو سردار تھا اس کی نعش مبارک پر گھوڑوں نے ٹاپ مارے، اس کی ہڈیوں کو کچلا اور آسانی کے ساتھ یہ مراحل طے ہو گئے، آخر میں اس کی عزت و ناموس پر بھی حملہ کیا گیا، اس کے گھر کی خاتونوں کو جو جنت کی خاتون کی لخت جگر تھیں ان کو رسیوں میں باندھا گیا، زمین پر گھسیٹا گیا اور یوں اس کو جو کچھ دیا تھا، ہنستے ہوئے چہرے، مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ اس نے سب واپس کر دیا، اور **ان تؤدوا الامانات الی اهلها** کی ایک ابدی تفسیر جریدۂ عالم پر اسی کی بدولت ثبت ہوئی، نہ اتنا کسی کو ملا اور نہ اتنا کسی نے دیا، کون اندازہ کرے اس شخص کی نعمتوں کا، جو خالق کے محبوب کا محبوب تھا، وہ اس کا پیارا تھا، اس کے کندھے پر کھیلنے والا تھا، اس کی پشت مبارک کا سوار تھا، اس کے لبہائے اقدس کا وہ بوسہ گاہ تھا، کیا آفتاب اس کے حکم کا منتظر نہ تھا، زمین اس کے آگے جھکی ہوئی نہ تھی، جبرئیل امین اس کے فرمان سے سرتابی کر سکتے تھے، فرات اس کا نہ تھا، تو پھر کس کا تھا، لوگ کہتے ہیں (ا) کہ اس نے میدان

کربلا میں تلوار چلائی، نیزہ کو جنبش دی؛ حالانکہ کیا کسی مستند تاریخ سے اس کو ثابت کر سکتے ہیں، اس کی تلوار کی باڑھ کون سنبھال سکتا تھا، جب اس کے الفاظ کی برداشت کی صلاحیت کسی میں نہ تھی، قاسم نے جب یاعم کہہ کر پکارا اور ضبط نہ کر سکا تو کس نے نہیں دیکھا کہ قاتل کا گھوڑا اپنے سوار کو پیٹھ سے گرا کر گھسیٹتا جاتا تھا اور چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اسکی لاش پارہ پارہ ہوگئی۔

بہر حال نیل کے کنارے خائن سے امانت چھینی گئی، پھر نہ اس پر آسمان رویا اور نہ زمین روئی اور فرات کے ساحل پر امینِ صادق نے امانت واپس کی، پھر دیکھو! اس پر دنیا روئی، قوموں نے ماتم کیا، نسلوں نے آنکھوں سے آنسو بہائے، صدیوں نے اس کے نوحہ کو سنا، قرنوں میں اس کا گریہ وبکا گونج رہا ہے، افغانستان سے کراہ کی آواز آرہی ہے، ٹیونس والوں کا دل پانی ہو رہا ہے، ہندوستان کے اکثر شہر اور اس کی بستیوں میں نالے بلند ہو رہے ہیں، ایران کا کلیجہ پھٹ رہا ہے، عرب کی آنکھوں میں بھی آنسو بھرے ہوئے، مصری بھی بے چین ہیں۔

الغرض جس نے امانت میں خیانت کی تھی، اس پر اس کے جاہ وحشم، مال و دولت پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین روئی اور جس نے امانت کو نہایت صفائی کے ساتھ، پوری قوت کے ساتھ بغیر کسی آلودگی کے واپس کیا، اس پر عرب وعجم سب کے سب مصروف گریہ وبکا ہیں، صدیوں سے ہیں، قرنوں سے ہیں اور اب تو اس پر تیرہ سو برس گذر چکے ہیں، یہ رونا نہ تھمیگا، یہ ماتم نہ ختم ہوگا۔

کون ہے؟ نسل انسانی میں، کون ہے جس پر آسمان وزمین تو خیر، آسمان و زمین جس کے لئے ہے یعنی بنی نوع انسانی نے اس پر غم کا اظہار اس طرح کیا ہو، کیا ہندو کسی پر اس طرح روئے، کیا عیسائی اپنے کسی شہید پر اس درجہ غمزدہ ہوئے، کیا بودھ کے پیروؤں میں اس کی کوئی نظیر ہے، کیا یہودیوں کا کوئی شہید اتنا مشہور، اتنا بلند ہے

کیا پارسیوں کی محدود جماعت کی کوئی قربانی اس احترام کی مستحق قرار پائی؟ پرانی تاریخوں میں بلا شبہہ ایسے قتیل نظر آتے ہیں، جن کے خون کو دیکھ کر انسانی فطرت بہت مضطرب ہوئی ہے اور کچھ دن کے لئے کسی مخصوص ملک کے کسی خاص علاقہ میں اس اضطراب نے آنسوؤں کی شکل اختیار کی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی وسعت زمانی، ومکانی، اتنی گہری اور عمیق غمناکی کی تاریخ میں کون دکھا سکتا ہے؟ اور یہی مراد ہے؟ ''سرالشہادتین'' میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی، کہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت جہری شہادت تھی اور اسی وجہ سے شہرت میں اتنا بلند رتبہ حاصل کیا۔

خائن کے متعلق جب قرآن مجید کا نص قطعی وارد ہے ''**ما بکت علیھم السماء و الارض**'' اور محل طعن وملامت میں واقع ہے، تو کیا جس شخص پر آسمان وزمین سے بھی زیادہ گرامی ہستیاں روئیں، اس سے اس کی تعریف وتقدیس نہیں نکلتی۔

یہ سچ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انا برئ ممن حلق و صلق و خرق (بخاری ومسلم) جس نے مردہ کے ماتم میں سر منڈایا اور زور زور سے چیخا اور کپڑے پھاڑے میں اس سے بری ہوں۔

اور بلا شبہ حدیث میں ہے کہ:۔

لیس منا من ضرب الخدود و شق الجیوب و دعی بدعوی الجاھلیة (بخاری) جو کلو پر طمانچے مارتا ہے یا گریبان پھاڑتا ہے یا جاہلیت والوں کی طرح بین کرتا ہے وہ ہم سے نہیں ہے۔

پھر کیا ان حدیثوں کے بعد بھی میں ان نادانوں کی تائید کروں گا، اپنے سینوں پر لوہے کی زنجیریں پٹکتے ہیں یا اپنے بال و پر نوچتے ہیں، یا مصنوعی اوزاروں کے ساتھ ایام جاہلیت کے دستور کے مطابق دہاڑیں مارتے ہیں، میں ان سے وہی کہوں گا جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن عبادہ کی عیادت کے وقت صحابہ کو مخاطب کر کے

ارشاد فرمایا تھا:

الا تسمعون ان اللہ لا یعذب بدمع العین و لا بحزن القلب و لکن یعذب بھذا و اشار الی لسانہ (بخاری ومسلم) کیا تم لوگ نہیں سنتے ہو، اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسوؤں یا دل کی کراہ پر سزا نہیں کرتا؛ بلکہ اس کی سزا اس پر ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ فرمایا۔

مطلب یہ ہے کہ چیخ وپکار، بین اور ہنگامہ ناسزا اور ناجائز امور ہیں، لیکن دل کی رقت، طبیعت کے ہیجان، آنسوؤں کے میلان کو کون روک سکتا ہے؛ بلکہ روکنے والے کو ذرا سنبھل کر سوچنا چاہئے کہ وہ کہیں ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو تو نہیں چھوڑ رہے ہیں، بخاری میں ہے کہ جب ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزع طاری ہوا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اس پر عبدالرحمٰن ابن عوفؓ نے دریافت کیا کہ **و انت یا رسول اللہ** آپ یارسول اللہ! روتے ہیں؟ آپ نے فرمایا **انھا رحمة** (یہ رحم اور ترس ہے) اتنا فرمایا تھا کہ پھر آنکھوں سے دوسرا سلسلہ جاری ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم روتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے، آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، دل غمناک ہے اور ہم نہیں کہتے؛ لیکن وہی جو ہمارے رب کی مرضی ہو۔

مخصوص دنوں میں اپنے کو رونے پر تم کیوں آمادہ کرتے ہو، کیا کربلا کا حادثہ ایسا حادثہ ہے جس پر دل کی غم انگیزی کبھی ختم ہوسکتی ہے، یہ صحیح ہے کہ ماہ محرم میں یہ واقعہ زیادہ یاد آتا ہے اور یہ قدرتی امر ہے، ممکن ہے کہ اس موسم میں جگر کی ٹیس زیادہ بڑھ جائے، دل میں زیادہ شدت کے ساتھ ہوک اٹھے، اندرونی بے چینیاں بیرونی آنسوؤں کی شکل اختیار کریں؛ لیکن اس غم کے لئے دن کیوں بناتے ہو، جو غیر محدود، سوز کا طالب ہے، اس کو محدود بنا کر تنگ کیوں کرتے ہو۔

اور میں تم پر کیا ملامت کروں کہ اب تو ہمارے دشمن اور ان دشمنوں کے سحر سے مسحور ہو کر خود ہمارے گھر میں ایسے لوگ ہیں جو اس جہری شہادت کو سری بنانے کی فکر میں مصروف ہیں؛ بلکہ ان میں کتنے ہیں جو اس شہادت کو شہادت کے درجہ سے گرانا چاہتے ہیں، وہ اب مشورہ دے رہے ہیں کہ امام حسینؓ کو یہ نہ کرنا چاہئے اور ان کو یہ کرنا زیادہ مناسب تھا، پچپن سال کے بزرگ امام علیہ السلام تیرہ سو برس کے بعد ان پیشہ ور مورخین کے مشوروں کے کس حد تک محتاج ہیں، اس کا تصفیہ خود ان کی عقل کر سکتی ہے۔

لیکن میں تو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی اس نکتہ شناس طبیعت کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے ''سرالشہادتین'' میں لکھا ہے:

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شہادت دراصل فضائل و کمالات کے سلسلہ میں ایک اہم حقیقت ہے اور ''نبوت کبری'' جو تمام فضائل و کمالات کی آخری حد ہے، ضروری تھا کہ اس میں یہ کمال بھی شریک ہو؛ لیکن ''منصب نبوت'' کی شان عالی میں اس سے اختلال کا اندیشہ تھا، اس لئے قدرت نے اس کمال کو بجائے باپ کے ''بیٹے'' کی طرف منتقل کر دیا، شاہ صاحب نے صحیح حدیثوں سے امام حسینؓ کا فقط نواسہ ہونا نہیں، بلکہ ''ابن'' بیٹا، ہونا ثابت کیا ہے اور عقلی طور پر اپنے اس دعوی کو اس سے مدلل کیا ہے، کہ حضرت امام حسینؓ اپنے جسم کے نصف حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خلقۃً بہت زیادہ مشابہ تھے۔

پس جو کمال بیٹے کو ملا، وہ باپ ہی کو ملا، کیوں کہ گو انجیل میں ہے کہ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب بیٹے کا ہے؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ (۱) بیٹے کا ہے سب باپ کا ہے'' اور اس بنیاد پر شاہ صاحب کا یہ قول بالکل درست ہے، کہ جو فضیلت امام حسینؓ کو حاصل ہوئی، وہ دراصل سرور کائنات صلی اللہ

(۱) یہ قانون اس حدیث سے پیدا کیا گیا ہے، جس میں ہے کہ ''انت و مالک لا بیک'' بعضوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے تو اور تیرا مال باپ کا ہے اور بعضوں نے کہا کہ تو اور جو کچھ تیرا ہے تیرے باپ کا ہے۔

علیہ وسلم کے فضائل میں داخل سمجھی جائے گی۔

بہر حال شاہ صاحب نے یہ کس قدر صحیح ارقام فرمایا ہے کہ ''فضیلت شہادت'' سے منصب نبوت میں اختلال کا اندیشہ تھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ یہی فضیلت جب نبوت سے ہٹ کر امام پر اور باپ سے ہٹ کر بیٹے کو ملی، تو ہمارے دلوں میں وسوسوں کے کتنے سمندر موج مارنے لگے، خصوصاً آج کتنے ہیں، جو اتفاقی واقعہ کہہ کر اس کی اہمیت کے گھٹانے کے درپے ہیں، اور ان میں ایسے بہت ہیں جو علانیہ کہہ رہے ہیں کہ ''جب حکومت و سلطنت سے مغلوب ہو کر کربلاء میں شہید کا خون بہا، خاکم بدہن میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ اپنی خانگی صحبتوں میں، اس کو جذبہ ضد اور ہٹ دھرمی کا ایک کرشمہ سمجھتے ہیں، ان کو امام کی ولایت میں بھی شبہ ہے، وہ ان کی ملکوتی قوتوں کے متعلق اظہار تذبذب کرتے ہیں، وہ امام ہمام سید الشہداءؓ کے متعلق وہی باتیں سوچتے ہیں جو عصر حاضر کے گم کردہ راہ پیرزادوں کے متعلق دیکھتے ہیں۔ اور ان اوہام و وساوس کی بنیاد کیا ہے؟ وہی فضیلت شہادت، جو باپ کی جگہ بیٹے کو ملی؛ اگر امام حسینؓ کربلاء میں ان خصوصیتوں کے ساتھ شہید نہ ہوتے تو ان وسوسوں کی کہاں گنجائش تھی؟

پھر غور کرو کہ اگر یہی شہادت خاص ''ذات نبوت'' کے ساتھ ظاہر ہوتی، تو ان بیماروں کے ایمانوں کا کہاں ٹھکانہ تھا، اس وقت تو ان کے بیٹے کے عقل و اخلاق میں نقص نظر آتا ہے، تو اسی عیب سے وہ باپ کو بری رکھنے پر قادر تھے، ان کی بربادی تھی اور کیسی بربادی تھی اور اب بھی وہ کب بربادی سے بچے ہوئے ہیں، انھوں نے پھل پر اعتراض کیا ہے، تو کیا وہ بھول گئے کہ درخت ان کی زبان کی برچھیوں سے محفوظ رہا، پھل کیسا پھل، جس نے بتول رضی اللہ تعالی عنہا کے آغوش میں پرورش پائی، حیدر کرار کی نگرانی میں ہوش سنبھالا، بلکہ سچ ہے کہ جس کو دنیا کے سب سے بڑے پیغمبر صلی

اللہ علیہ وسلم نے ماں کی طرح پالا اور باپ کی طرح نگہداشت کی، وہی جسے ابوبکر صدیقؓ نے ہمیشہ پیار کے ساتھ وہ سب کچھ سکھایا جو اس کے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا، فاروق اعظم کی توجہ جس پر اپنے بچوں سے زیادہ تھی، ذوالنورین کو جو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا اور سارے صحابہ کی آنکھوں (۱) کا جو نور تھا، ان درختوں کی مجموعی قوت سے جو پھل پیدا ہوا تھا، افسوس ہے تم پر افسوس ہے کہ تم کو کسی اور کی عقل میں تاریکی نظر نہیں آئی، کسی اور کے اخلاق میں ہٹ اور ضد کی کدورت تم کو معلوم نہ ہوئی اور معلوم ہوئی تو کہاں معلوم ہوئی، ہمارے ریسرچ ورک (تفتیشی مجاہدات) کے لئے تو بڑا میدان تھا، پھر اس وادی پرخار میں اترنے کی کیا ضرورت تھی؟

جس نے پچپن سال کی عمر رضا و تسلیم، خاموشی اور خمولت میں گذار دی، جس نے باوجود گھوڑوں اور پرشوکت سواریوں کے، ایک دفعہ نہیں، دس دفعہ نہیں؛ بلکہ پچیس دفعہ ڈھائی سو میل کی مسافت طے کر کے اللہ (۲) کے گھر کا حج کیا، جو تین دفعہ اپنی ساری مملوکات سے دست بردار ہو کر بے خانماں ہو کر اپنا سب کچھ لٹا (۳) دیا، تم اس کے متعلق ایسے برے خیالات پکاتے ہو، فرات کے کنارے تو (العیاذ باللہ) وہ یزید کی دولت کو دیکھ کر آیا تھا؛ لیکن مدینہ منورہ سے مکہ معظّمہ پچیس دفعہ پیادہ پا کس غرض کو سامنے رکھ کر آتا رہا، اس کا کیا منصوبہ تھا، جب اس نے اپنی ساری جائداد کو تین دفعہ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔

شاہی طاقت پہلے جسموں کو جھکاتی ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کا دباؤ عقل پر پڑتا ہے، عقلی ربودگی کے ساتھ ہی وہ بھی جھک جاتا ہے، جس کے جھک جانے کے بعد ہر چیز جھک جاتی ہے، آخر جب دل ہی جھک گیا تو اب آدمی میں کون سی چیز باقی رہ جاتی

(۱) حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان تعلقات کو واقعات کی روشنی میں دکھلایا ہے۔ من شاء فلیراجع الیہ

(۲) علامہ شعرانیؒ نے اپنے طبقات میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ (۳) ایک سے زائد تاریخوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

ہے جو نہ جھکے، جذبات، ارادات، خیالات، حرکات، سکنات سب کے سب ان سیاسی بازی گروں کی انگلیوں پر ناچتے ہیں، جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ہوتی ہے۔

انسانیت کے لئے سب سے بڑی مصیبت اس وقت ہوتی ہے جب ان بازی گروں کے باطن میں خبث و شرارت کے عناصر غالب ہوتے ہیں، کہ اس وقت صرف وہی خبیث نہیں ہوتے؛ بلکہ وہ ساری روحیں جو ان کے سیاسی پنجوں میں گرفتار ہوتی ہیں سب کی سب گندی اور ناپاک ہو جاتی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خون کے فوارے بہا کر، انسانوں کی ایک جماعت تیار کی تھی، جس کے پاس صاف سینہ، پاک روح، مقدس نفس، سلیم قلب، عمیق علم، مستقیم عقل کے سوا اور کچھ نہ تھا، یہ ایسی پختہ، ٹھوس، مستحکم، غیر متزلزل جماعت تیار ہوئی تھی، کہ اس کے بعد یہ توقع بے محل نہ تھی کہ جو نسلیں ان سے نکلیں گی ان میں ان کمالات و فضائل کے جواہر قیامت تک چمکتے رہیں گے، یکایک امیہ کے گھرانے میں وہ بچہ پیدا ہوا جس نے اجسام کو قابو میں لا کر عقلوں پر قبضہ جمایا اور بالآخر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا، کہ کہیں قلوب و ارواح بھی ''نبوت کبریٰ'' کے قائم کئے ہوئے مرکز ثقل سے ہٹ جائیں اور اندیشہ کیا جب ان میں ابن زیاد، عمرو بن سعید، شمر پیدا ہو چکے تھے، تو کیا اس کے بعد بھی ہم اس کو فقط اندیشہ ہی سے تعبیر کرتے رہیں گے؟ کیسا خطرناک وقت، کتنی سخت گھڑی کہ درخت کی شاخوں کو نہیں؛ بلکہ اس کی جڑوں کے ہل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا، کیا کیا جاتا؟ ایسے وقت میں کیا کیا جاتا، کیا یزید کی گردن اڑا دینے سے یزید مر جاتا؟ یزید مر جاتا لیکن اس کی روح کس طرح مرتی، جس کا وزن امت کے دل پر، دماغ پر، عقل پر پڑ رہا تھا، یہ خدا کی سجھائی ہوئی حکمت تھی کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا تھا ان میں سب سے زیادہ ذی اثر، با اقتدار تھا، ان کا سب سے زیادہ پیارا محبوب تھا، وہ فاطمہ کے حجرہ سے نکلا اور بجائے

یزید کے خود اپنے گلوئے مبارک پر خنجر چلوا دیا، سر مبارک تن سے کیا علحدہ ہوا، کہ مسلمانوں کے مسخر قلوب ان کی مسحور عقلیں، ان کا سویا ہوا دماغ یکا یک یزید کے عقلی اور ذہنی دباؤ سے بھی علحدہ ہوگیا، بہ ظاہر یزید زندہ رہا؛ لیکن عارفوں نے دیکھا کہ اس کی روح مرگئی اور یہی مقصد بھی تھا، نانا کی دیوار کو کون سنبھالتا، حسین علیہ السلام نہ سنبھالتے تو پھر کس کا زہرہ تھا کہ اس میدان میں اترتا، اور خود اپنے خون سے اس دیوار کی ہلی ہوئی چٹانوں کو پھر مضبوطی کے ساتھ جمادیتا، حاجی محمد علی سچ فرماتے ہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جب یزید کی روح زندہ تھی تو اس سے کوفیوں کی فوج پیدا ہوئی اور جب حسین علی السلام کو حیات جاوید بخشا گیا تو دیکھو! اسی کوفہ سے ابراہیم نخعیؒ، حماد، ابوحنیفہ، شعبی جیسے اکابر روحانیین نکلتے چلے آتے ہیں اور صرف کوفہ کیا، کربلا کے بعد جو بھی آئے اور جہاں بھی آئے، جس شان میں بھی آئے، جنید بن کر آئے یا شافعی، امام مالک کی شکل میں نمودار ہوئے یا سفیان ثوری کے لباس میں، یہ سب اسی زندہ روح کی ہمت مردانہ کا نتیجہ تھا۔

امام کی عظمت کون پیدا کرسکتا ہے، اس بلند مینارے پر کون قدم جما سکتا ہے، جس پر حسین علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، ایسی ہمہ گیری، ہر دلعزیزی کس کے حصہ میں آسکتی ہے کہ جس کا انتقام دنیا صدیوں سے لے رہی ہے اور اب تک انتقام پورا نہیں ہوا ہے، قرنوں سے نفرت کی موسلا دھار بارش یزید اور اس کے ساتھیوں پر ہو رہی ہے؛ لیکن تشنگی نہیں بجھتی جس طرح پہلی صدی ہجری میں اس کے اعمال سے دلوں نے بیزاری ظاہر کی، آج تک وہ بیزاری اسی آن بان کے ساتھ قائم ہے، کتنا گہرا، کتنا پختہ رنگ اے خون امام علیہ السلام تو نے پیدا کیا **فرضی اللہ عنک و عن**

الصحابک امت مرحومہ یوں تو آپ کے گھرانے کے فیوض و برکات میں ازسرتا قدم غرق ہے اور رہے گی؛ لیکن ان احسانوں میں کتنا بڑا احسان ہے جو آپ نے ہم بے کسوں کے ساتھ کیا۔

اگرچہ آپ نبی نہیں ہیں؛ لیکن نبی زادے ہیں اور اسی لئے آپ سے وہ کام بن آیا جو اولوالعزم من الرسل کے شایان شان ہے، **فجزی اللہ عنا و عن المسلمین خیر الجزاء.**

آج اسلام کا جہاز پھر اسی گرداب میں آپھنسا ہے، پھر مسلمانوں کے اجسام اور اجسام کے بعد عقول، عقول کے ساتھ قلوب غیر اسلامی اثرات کے نیچے دبے چلے جاتے ہیں؛ لیکن ایسا کون باثر ہے، اتنا اقتدار کس کو حاصل ہے، جو اپنے سر کو علحدہ کرا کے قلوب کو بھی ان سے علحدہ کرلے، اٹھے گا، فاطمہ ہی کے گھرانے سے کوئی اٹھے گا، روحیں اجنبی دباؤ کے پنجے میں اب زیادہ دیر تک نہ پھڑ پھڑائیں گی، قلوب غیروں کے وزن کو شاید اب زیادہ مدت تک نہ محسوس کریں گی، عقول کفر کی راہوں میں اپنے لئے روشنی نہ تلاش کریں گی۔ **فتربصوا انا معکم من المتربصین.**

میں اور بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا، لیکن
جو کچھ دل میں وہ، کیا زبان یا قلم پر سب کا آنا ضرور ہے۔

ہزار نکتۂ باریک تر زمو ایں جا ست

بعض باتیں عام کی جاتی ہیں اور بعضوں کے لئے صرف اہل کی ضرورت ہے، نفع اٹھانے والوں کے لئے اس میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کم نہیں ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل .

ماہنامہ القاسم دارالعلوم دیوبند، محرم وصفر ۱۳۳۵ھ